شاہ محمد کا ٹانگہ
افسانے
علی اکبر ناطق

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیش نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

شاہ محمد کا ٹانگہ

سیّد گلزار حسنین کے نام

شاہ محمد کا ٹانگہ　　　افسانے　　　علی اکبر ناطق

اشاعت اول : 2017ء
سرورق : سید رضا زیدی
تعداد : 500
قیمت : 300
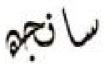
Shah Muhammad ka Tanga
(Urdu short stories by Ali Akbar Natiq)

Printed by:
Maktaba Jadeed Press, Lahore.

Price:
In Pakistan: Rs. 300.00

Published by:

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS

Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN: 978-969-593-227-8

فہرست

گت

رفیق ساڑھے چھ فٹ قد اور چوڑی چھاتی کے ساتھ دس بھینسوں کا مالک تھا۔ ڈانگ لکڑ ہاتھ میں لے کر نہ چلتا لیکن سامنے شیر بھی آ جاتا تو فوراً ٹکرا جاتا۔ آنکھیں موٹی اور سرخ انگارہ تھیں مگر کم لوگوں کے ساتھ اُس کا دنگا ہوا۔ ایک عیب اُس میں ضرور تھا۔ لوگوں کے کھیتوں سے چوری کا چارہ کاٹ کر لے جاتا۔ اگرچہ دن کے وقت بھی کسی کے کھیت کو نگ لگا دیتا تو پوچھنے والا کوئی نہ تھا مگر وہ سینہ زوری نہ کرتا۔ شمشیر خاں اُس کا ایک ہی دوست تھا، جس کے ساتھ اِس کا بیٹھنا اُٹھنا تھا۔ جثے اور قد کاٹھ میں شمشیر خاں رفیق سے بھی نکلتا تھا۔ شمشیر کے ہاتھ میں ہر وقت پانچ فٹ لمبی ڈانگ ہوتی۔ جسے زمین پر کھڑ کھڑ بجاتا ہوا جاتا۔ بختو نام کی ایک کتیا ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتی۔ کتیا اتنی خطرناک اور کاٹنے والی تھی کہ دیو بھی اُس کے نزدیک آنے سے ڈرتا۔ بختو ایک قسم کی اُس کی روح تھی۔ رفیق کی نسبت شمشیر عقل کا موٹا اور ہاتھ کا تیز تھا۔ ذرا سی بات پر سامنے والے کو جھانپڑ لگا دیتا اور مار پیٹ کے بعد معافی مانگ لیتا۔ یہ بھی ایک طرح سے لوگوں کی انا کو مجروح ہونے سے بچاتا تھا۔ شمشیر خاں رفیق کی طرح چوری تو نہ کرتا لیکن گاؤں میں ہلہ گلہ بچائے رکھتا۔ کمزوروں کی خدمت کا ایسا پکا تھا کہ جو پہلے شکایت لے کر آ گیا، اُسی کے ساتھ ہو لیتا، پھر دنیا کی کوئی دلیل اُس کے سامنے مخالف کا حق پر ہونا ثابت نہ کر سکتی۔ اپنی خوشامد سُن کر پھول جاتا اور کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا۔ اکثر لوگ شغل میں ہی اُس کے ہاتھ سے ایک دوسرے کی دھلائی کرا دیتے۔ جس گدھے پر چارہ ڈھوتا، بعض اوقات اُسی سے زور آزمائی شروع کر دیتا۔ گدھا تو گدھا ہوتا ہے، کبھی اَڑ پھنس کی، یہ اُسے چت کرنے کے لیے کشتی شروع کر دیتا۔ پھر آدھے گھنٹے بعد دونوں ہانپ کانپ کر گر جاتے۔

کچھ دن سے یار لوگ شمشیر خاں کو رفیق سے بھڑ جانے پر اُکسا رہے تھے اور ایسی

ترکیب کی تلاش میں تھے کہ دونوں کا جوڑ پڑ جائے۔ ایک دن شمشیر خاں اپنی بختو کی زنجیر پکڑے مسجد کے بڑے کنویں کی منڈیر پر بیٹھا تھا کہ کچھ خوشامدیوں نے گھیر لیا اور اُس پر مجھر کیاں چڑھانے لگے۔

حبیب جٹ، میاں شیرے تمھاری کیا بات ہے۔ چاہو تو ہاتھی کی سونڈ پکڑ کر گاؤں کے چوک میں کھڑے پیپل سے باندھ دو اور شیر تمھارے سامنے گھٹنے کا پلا ہے۔ گینڈے اور سانڈ تک، تمھاری پھونک سے اُڑ جائیں۔ پھر دوسرے لوگوں کی طرف منہ کر کے، بھئی تمھیں شمشیر کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ مَیں نے ایک دن اپنی ان شیشے جیسی آنکھوں سے دیکھا، شیرے نے ہل جوتا ہوا تھا۔ دوپہر سر پر تھی۔ گرمی کی وجہ سے پسینے کی نہریں جاری تھیں۔ شیرا ہل کی اَرلی پکڑے ساڑیں لگا رہا تھا۔ ایک جگہ شیرے کا بیل لاکھا اُڑ گیا۔ اِس نے دُم کو مروڑا، چوب ماری، ہشکارا مگر وہ سور کی طرح وہیں اَکڑ گیا۔ نہ آگے جاتا ہے نہ پیچھے ہٹتا ہے۔ مَیں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، لاکھے کی شامت آئی کہ آئی۔ کچھ دیر بعد وہی ہوا، شیرے نے غصہ کھا کے لاکھے کی کمر پہ یہ زور کی گُہنی ماری کہ اللہ معاف کرے۔ میرے پاؤں کی زمین ہل گئی۔ میں سمجھا زلزلہ آ گیا۔ گُہنی کی ضرب سے لاکھا نیچے ہی بیٹھتا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جو بے زبان کو ہوش آیا اور سُرت بحال ہوئی تو ایک دم اُٹھ کے بھاگا اور سہ پہر تک ایک ایکڑ زمین تکپٹ کر دی۔ کیوں شیرے، بتا ناذرا نہیں وہ قصہ۔

اس بات کو چھوڑو، شمشیر نے بختو کی زنجیر اپنی ٹانگ سے باندھ کر ہاتھوں کو آزاد کیا اور بولا، ایک بار مَیں یونہی پگڈنڈی کنارے جا رہا تھا۔ یہ بھاگاں والی بختو آگے آگے مٹکتی جاتی تھی۔ ہم پگڈنڈی پر تھے اور دونوں جانب اُونچے اُونچے کماد کے کھیت تھے۔ اچانک ایک ہی بار جھٹکا سا ہوا اور میرے دیکھتے ہی بختو غائب۔ چوں تک نہ کی بیچاری نے۔ بس ایک جھپکے کی دیر میں کماد سے بھیاڑ نکلا اور دیکھتے ہی بختو کو گردن سے دبوچ کر اُسی کماد میں جا گھسا۔ تمھیں تو پتا ہے میری اِس کرماں والی میں جان ہے۔ مَیں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پیچھے چھلانگ لگا دی۔ اب جو دیکھا تو تین تین بھیاڑ تھے۔ بختو بیچاری مدھولی جا چکی تھی۔ ایک منٹ مَیں نہ پہنچتا تو اس کی انتڑیاں کماد کی جڑوں سے لپٹی جا چکی ہوتیں۔ جیسے ہی بھیاڑوں نے مجھے دیکھا، آئے میری طرف۔ یہ بڑے بڑے ڈیلے نکال کر۔ لو جی اُس وقت مَیں نے بھی دلیری پکڑی اور بھیاڑ ہی تو بن گیا۔ خون میری آنکھوں میں اُتر آیا اور جنگ شروع ہو گئی۔ کسی کا پنجہ بچاتا ہوں تو کسی کے دانت۔ ایک بھیاڑ نے

میری لنگی کو اپنے جبڑوں میں ایسے دبوچ کر کھینچا کہ پل میں لیرو لیر ہوگئی اور مَیں الف ننگا۔ وہ تو بچت یہ ہوئی کہ اُس کے جبڑوں میں میرا الف نہیں آیا ورنہ تو میں سرے سے ہی کام سے گیا تھا۔ جو اُن میں سب سے بڑا تھا، اُس کو آخر مَیں نے یہ جھانبڑ لگائی کہ تین قلابازیاں کھا گیا۔ دوسرا سیدھا اُستروں جیسے پنجے اور برچھی کی طرح دانت نکال کر میرے منہ کی طرف آیا۔ میں نے ٹوکی کا وار یوں اُس کے پیٹ میں اُتارا کہ وہ تو خنزیر وہیں ڈھیر ہوگیا۔ ایک جو پہلے والا تھا جس نے مجھے ننگا نچادیا تھا، اُس کو بائیں ہاتھ سے دھوبی پٹڑا دیا اور دے زمین پہ مارا۔ وہ بھی بہت تیز تھے۔ آنکھ جھپکتے ہی دوبارہ حملہ کردیتے۔

اور تمھاری بختو نے ساتھ نہیں دیا؟ غلام محمد نے پوچھا۔

شمشیر ہنس کر بولا، تم بھی بادشاہ ہو بھئی غلام محمد۔ یہ بچاری تو بے سُتی ہوئی پڑی تھی۔ مجھے تو فکر تھا کہیں مر ہی نہ گئی ہو۔ اس کو اُس وقت ساتھ دینے کے کہاں ہوش تھے۔ ظالموں نے ایک ہی منٹ میں اسے رگڑ دیا۔ خیر بھئی، یہ لڑائی دو گھنٹے جاری رہی۔ دو کنال کماد کا صفایا ہو گیا۔ اللہ اللہ کر کے وہ تینوں بگھیاڑ مَیں نے اُسی ٹوکی سے کاٹے۔ میرا اپنا جسم بھی لہولہان ہوگیا۔ بختو کو اُٹھا کر گھر لایا۔ شوہدی کو شام تک کہیں جا کر ہوش آیا۔

شریف بولا، یہ بات تو ہے شیرے تم میں۔ ہم ہوتے تو وہیں مُوت نکل جاتا اور بختو کو بگھیاڑوں کے صدقے کر کے گھر کی طرف دُڑکی لگا دیتے۔ خدا کی قسم آج راجہ ارجن ہوتا تو تیرا پانی بھرتا اور ہنومان دُم دبائے پھرتا۔

دستگیر جو ایک طرف چپ کھڑا تھا، شریف کی بات سُن کر بولا، واہ شریفے، تُو بھی کتنی اوچھی اور دُور کی کوڑی لایا ہے۔ بھلا ہنومان باندر اور ارجن پلپلے دار کا شمشیر سے کوئی میل ہے؟ اپنا شمشیر ہے علی کا شیر اژدروں کو پھاڑنے والا اور وہ صرف رام کے چیلے چانٹے۔ پھر شمشیر کی طرف منہ کر کے بولا، پر ایک بات تمھیں بھی ماننی پڑے گی شیرے۔ جگرے والا اپنا رفیق محمد بھی بہت ہے۔ چاہے رام لشمن دونوں آ جائیں، رفیق خاں، علی مولا کا نام لے کر دونوں کو اُنگلی پر اُٹھا لے گا۔ بھائی اُس کے ہاتھ کیا ہیں؟ لوہے کی سنخیں ہیں۔ بس یوں سمجھو کہ عزرائیل کے پنجے ہیں۔ جس پر جا پڑتے ہیں روح قبض کیے بنا نہیں چھوڑتے اور دلیر ایسا کہ نادر شاہ کی فوجوں پر اکیلا جا چڑھے۔ پورا لشکر ایک طرف ہو جائے تو بھی ماں کا جنا پیٹھ دکھا کے نہیں بھاگتا۔

ہاں، غلام محمد بولا، اور میں تو کہوں گا، اِدھر اُدھر دس بارہ گاؤں میں تو اُس کے توڑ کا آدمی کوئی نہیں۔ پندرہ بھینسوں کا چارا تین میل سے سر پر اُٹھا کر لے آئے۔ مجال ہے اُس کی گردن میں موڑ آئے۔

شمشیر خاں کو غلام محمد کی یہ بات اچھی نہ لگی، وہ بولا، یہ کون سا بڑا کام ہے۔ یہ تو میں بھی کرلوں گا۔

دلگیر علی دوبارہ بولا، شمشیر خاں اِس کام میں تو وہ تم سے آگے ہے۔ یہ تو تم کو بھی ماننا پڑے گا۔ پھر شرارتاً مسکرا کر، شمشیر خاں ویسے تھوڑا تھوڑا تم اُس سے ڈرتے بھی ہو۔

شمشیر خاں غصے سے لال ہوگیا اور کھینچ کے ایک لمبا ہاتھ دلگیر کے مارا اور سر گھما دیا۔

دلگیر گال لوستے ہوئے بڑبڑایا، ہمیں کیوں مارتے ہو؟ کمزور پر ہر کوئی ہاتھ اُٹھا لیتا ہے۔ مزا تو جب ہے، رفیق سے پچھاڑ لو۔

حبیب جٹ نے کہا، شمشیر خاں یہ تم نے مردوں والی نہیں کی۔ بیچارے دلگیر کا کیا گناہ ہے؟ اِسے مار لیا دیوار کو مار لیا ایک جیسا ہے۔ درانتی ہرا گھاس تو مزے سے کاٹتی ہے، پکی چری پر چلے تو دانت کھنڈے ہو جائیں۔

شمشیر نے شرمندگی سے حبیب جٹ کی طرف دیکھا تو وہ دوبارہ بولا، بات تو شمشیر خاں، دلگیر نے حق سچ کی ہے۔ تمھارا جوڑ اصل میں رفیق سے بنتا ہے۔ ہمارے سر پر تو مفت میں گنگے جماتے رہتے ہو۔

شمشیر خاں اب پوری طرح طیش میں آ گیا، بولا، لو میں کل ہی فیکے کو چیلنج دیتا ہوں۔ پھر جھجکتے ہوئے بولا، پر یہ اچھی بات نہیں۔ وہ ہے میرا یار۔

اب غلام علی نے آگ پر مزید تیل چھڑکا، تو کیا اتنی سی بات سے یاری ٹوٹ جائے گی؟ اگر ایک چیلنج سے یاری ٹوٹتی ہے تو یاری نہ ہوئی، سُوت کا دھاگا ہوا۔

ٹھیک ہے میاں، شمشیر خاں نے اپنے گھٹنے سے بختو کی زنجیر کھولی اور اُٹھ پڑا۔ کل دوپہر صید شاہ کے نیم والے تھڑے پر آ جانا۔ وہیں چیلنج دوں گا۔

....

نیم کی گندولیاں پک کر پیلے رنگ کی ہو گئیں تھیں اور شاخوں پر پتوں کی سبزی چھاؤں کو

ٹوہ رہا کر رہی تھی۔ یہ دن اگست کے شروع کے تھے، جب بارشیں اور حبس پورا مہینہ ایک ساتھ رہتے ہیں لیکن آج خوشگوار دن تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے چار پائیاں گھنے پیڑ کے نیچے رکھے، حقے کا دھواں اُڑا رہے تھے۔ ارد گرد بیٹھے لوگ، جنہیں خموش بیٹھ کر تماشا دیکھنے کی اجازت تو تھی، بولنے کی نہیں، وہ خموشی سے دیکھنے لگے۔ رفیق سارے معاملے سے بے خبر تھا۔ شمشیر نے ایک دو دفعہ رفیق کو گہری نظر سے دیکھا اور بولا، فیکے میں آج تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ لوگوں کا زبردستی یا چوری چارہ نہ کاٹا کر۔

تمھیں اس کا ٹھیکہ ہے۔ رفیق شمشیر کی اس اچانک بے تُکی بات پر غصے سے بولا۔

بھئی لوگ مجھے طعنہ دیتے ہیں کہ فیکا تیرا یار ہو کر ہمارا نقصان کرتا ہے۔ تُو اُسے روکتا کیوں نہیں۔

رفیق! تو نہ سُنا کر طعنہ۔ سید ھا میرے گھر کا رستہ بتا دیا کر۔ پھر میں جانوں اور وہ۔

شمشیر! ان مظلوموں کی بات سُننا بھی تو میرا کام ہے۔

شمشیر ان باتوں سے تیرا مطلب کیا ہے؟ رفیق نے طنزاً مسکرا کر کہا، کیا تو گاؤں کا تھانیدار ہے یا دروازے پر عدل کی زنجیر لگائی ہے؟ اپنے کام سے کام رکھا کر۔

شمشیر بولا، فیکے میں گاؤں کا تھانیدار یا بادشاہ تو نہیں، پر یہ جان لے، اگر کوئی تیرے علاوہ اس گاؤں کا نقصان کرتا تو میں کب کا اُس کی مونچھیں مونڈ کر اور اُن کی رسی بٹ کر اس نیم کے تنے سے باندھ چکا ہوتا۔

رفیق نے کہا، شمشیرے تُو کس سے بات کر رہا ہے؟ لگتا ہے آج بھنگ زیادہ چڑھ گئی ہے۔ میں تیرے سامنے رفیق خاں فرشتہ بیٹھا ہوں، کوئی بھیجا لنگڑا نہیں ہوں۔

میں بھی جانتا ہوں تُو اپنا فیکا ہی ہے، وہی فیکا جس نے پورے گاؤں میں اندھیر مچا رکھا ہے۔

رفیق نے اب دھیمے لہجے میں کہا، شمشیر خاں آخر تُو چاہتا کیا ہے؟ کیا میں نے کبھی تیرے چارے کو ہاتھ لگایا ہے؟

لگا کے دیکھ لے، شمشیر نے آنکھ میں آنکھ ڈال کر کہا۔

شمشیر آج تُو کدھر سے بول رہا ہے؟

بات یہ ہے فیکے، شمشیر نے آنکھوں کے ڈیلے باہر نکالے اور کہا، گلے سے بکری کی ٹانگ باندھنا

ایک بات ہے اور سرکاری سانڈ کے سینگوں پر ہاتھ ڈالنا دوسری بات۔ مانا کہ گاؤں کا کوئی بندہ تم نے نہیں چھوڑا، جس کا چارہ کاٹ کر نہیں لے گیا اور اُس کی فصل کا اُجاڑا تم نے نہیں کیا مگر وہ تو بچارے نری گابھن بھیڑیں ہیں۔ تیرا اُن کے ساتھ مقابلہ اصولی بنتا نہیں۔ چھ انچ لمبی مونچھ پر ہاتھ پھیر کر، جب مانوں، جب تُو میرے گاچے پر درانتی رکھے گا۔ فیکے، بلی کی مونچھ کا بال کھینچنا مردوں کا کام نہیں، شیر کے دانت گن کے دکھا، پھر تماشا دیکھ۔

شمشیر کی باتیں سُن کر اور بھرے مجمعے کو دیکھ کر فیکا سمجھ گیا کہ یار لوگوں نے ہوا بھری ہے، اس لیے تحمل سے بولا، شیرے اس گاؤں میں تُو میرا ایک ہی یار ہے۔ اب تیرے کھیت میں چوری کرتے کیا مجھے شرم نہ آئے گی؟ دنیا کہے گی، فیکا یار مار ہے۔

او چھڈ فیکے شیرا، یاری اپنی جگہ، مرد کی مونچھیں اپنی جگہ۔ مَیں جانتا ہوں، تیری زوراوری نے بڑے بڑے پہلوانوں کے منہ پھیر دیے، پر میرا دل کرتا ہے ذرا مجھ سے بھی تیری جینڈی پھنسے تو مزا آئے۔ کسی دن میرے چارے کی کروبلیں کاٹو گے تو لوہے کا کڑیالا منہ میں نہ دیا تو باپو نے شمشیر خان نام نہیں رکھا۔ مَیں مجھوں گاماں خیر بی بی کا نہیں، کھوتی کا دودھ پیا تھا۔

رفیق خاں اب غصے سے بولا، شمشیر خان، تجھے پتا ہے، اتنے چیلنج میرا باپ بھی دے تو مَیں اُس کی دُم پیچھے سے باندھ دوں، پھر بھی تجھے بڑھکیں مارتے خوف نہیں آتا، حقے کا لمبا گھونٹ بھر کر دھواں نتھنوں سے باہر کر کے نکالتا ہے، جا، اگر تیری یہی منشا ہے تو فیکے کا تجھ سے وعدہ ہے۔ تیرا اُکھڑا ہوا چارہ لے کر جاؤں گا اور یہ بھی بتا دوں، یہ کام اسی ہفتے کروں گا۔ اگر غیرت مند ہو تو مونچھ کی حفاظت کرنا۔ میں چارہ لے گیا تو اپنی مونچھ منڈواؤ گے۔

لا ہاتھ، شمشیر نے چیلنج پکا کرنے کے لیے فیکے سے ہاتھ ملایا، اب جو اپنی بات سے پھرے، اُس کی مونچھیں گدھی کے دودھ سے مونڈی جائیں گی۔

پاس بیٹھے سب لوگوں نے گواہی کے طور پر تالی بجائی۔

....

شرط کو چار دن ہو گئے۔ دونوں کی عزت کا مسئلہ تھا۔ پچھلی رات رفیق نے اپنی شرط پوری کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ رات کے دو بجے اُٹھا، دھوتی باندھی، چارپائی کی چادر بغل میں دبائی اور شمشیر خاں کے مویشیوں والے باڑے کی طرف چل دیا۔ یہ باڑہ گاؤں سے نصف کلومیٹر کے

فاصلے پر تھا۔ وہیں چارہ کاٹنے والی مشین تھی۔ شمشیر خاں کا نوکر شام کے وقت تمام چارہ کاٹ کے رکھ دیتا، تا کہ صبح بھینسوں کا دودھ دوہنے کے لیے بھاڑے کی آسانی رہے۔ شمشیر صبح سویرے دودھ لینے کے لیے ایک ہاتھ میں منکا اور دوسرے میں بختو کی زنجیر پکڑے باڑے کو روانہ ہوتا، دوپہر تک وہیں رہتا، نوکر کا ہاتھ بٹاتا اور بارہ بجے دودھ لے کر واپس گاؤں آجاتا۔ بختو ساتھ ملکتی آتی۔ یہ اُس کا معمول تھا لیکن جب سے رفیق کو چیلنج دیا تھا، یہ دودھ کسی کے ہاتھ گھر بھجوا دیتا اور خود بختو کے ساتھ وہیں راتیں گزارنے لگا۔ ساری رات جاگتا۔ سونے کو اپنے اُوپر گویا حرام کرلیا۔ چار پائی کترے ہوئے چارے کے بالکل ساتھ رکھ کے لیتا۔ پچھلی رات نیند غلبہ کرتی اور آنکھیں زبردستی بند ہو جاتیں تو اُسے رفیق اپنی چادر میں چارہ ڈالتے نظر آتا، وہ فوراً ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھتا لیکن اِدھر اُدھر کچھ نہ پاکر پھر لیٹ جاتا۔ بختو آرام سے چار پائی کے ساتھ بیٹھی رہتی یا آس پاس ٹہل لیتی۔ اگر یہ شرط فیکے کی بجائے کسی اور سے لگی ہوتی تو زیادہ فکر نہیں تھی۔ بختو سب کچھ سنبھال لیتی مگر مصیبت یہ تھی کہ بختو جس قدر شمشیر سے واقف تھی، اسی قدر فیکے سے بھی تھی۔

آج شمشیر نیند کے غلبے سے اِس قدر بوجھل تھا کہ دن کے وقت بھی نشے کی حالت میں لگ رہا تھا۔ رفیق جس وقت باڑے میں پہنچا، سوائے بختو کے باڑہ سویا ہوا محل بن چکا تھا۔ شمشیر کے خراٹے دھڑا دھڑ بجا رہے تھے۔ رفیق نے باڑے کی یہ حالت دیکھی تو ہلکا سا مسکرا دیا۔ پھر چار پائی کے ساتھ پڑا گنڈا اور لالٹین اُٹھا کر کماد کے کھیت میں پھینک دی۔ بختو نے اُس کی بُو سونگھ لی اور بھاگ کر قدموں سے لپٹنے لگی۔ فیکا آرام سے آگے بڑھا، کترے ہوئے چارے کے پاس چادر بچھائی، اُس میں چارہ ڈالا، پھر چادر کو چاروں کونوں سے باندھ کر بھاری پنڈ بنائی اور ایک ہی ہلّے میں اُٹھا کر سرکی طرف لے گیا۔ چارہ سر پر رکھ کر دو قدم چلا، پھر خیال آیا، ایسا نہ ہو شمشیر کہے، اُس کا چارہ چوری ہی نہیں ہوا۔ وہ پیچھے ہٹا، ایک زور کی ٹھوکر شمشیر کی چار پائی کو لگائی لیکن وہ سویا رہا۔ رفیق نے مزید دو ٹھوکریں ماریں، وہ پھر بھی نہ اُٹھا تو اُس نے گٹھڑ ہی اُوپر پھینک دیا۔ گٹھڑ کا گرنا تھا کہ شمشیر کو لگا جیسے بھونچال آ گیا۔ بڑی مصیبت سے اُس کے نیچے سے نکلا اور ابھی نیند اور گٹھڑ کی ضرب سے ہوش بحال بھی نہ ہوئے تھے کہ رفیق نے جلدی سے گٹھڑ دوبارہ سر پر رکھا اور چل دیا۔ کالی رات کا اندھیرا تھا اور نزدیک ہی گنے کا کھیت۔ رفیق کھیت میں گھس گیا۔ شمشیر نے اِدھر اُدھر لالٹین کو ٹٹولا مگر وہ غائب تھی۔ غنودگی میں اُسے کچھ نہ سوجھا کہ کیا کرے؟ بختو کو ہشکار کر پیچھے لگایا۔

کتیا نے شمشیر کے کہنے پر رفیق کا پیچھا کیا مگر پاس پہنچ کر خود بھی ساتھ چلنے لگی۔ شمشیر کو شدید اُلجھن نے گھیر لیا۔ ساری زندگی بختو اور گنڈے کے بغیر ایک قدم نہ چلا اور اب یہ دونوں چیزیں غائب تھیں۔ اُسے رہ رہ کر اپنے آپ پر، اُن لوگوں پر، جنہوں نے شرط لگانے پر اُکسایا، حتیٰ کہ بختو پر، جو آرام سے فیکے کی ڈولی چڑھ گئی تھی، شدید غصہ آنے لگا۔ شمشیر نے کئی بار بختو کو ہشکارا لیکن اُس کی آواز نہ آئی نہ خود آئی۔ آخر شمشیر نے تھک کر رفیق کو آواز دی، او فیکے شیرا، جو بھی ہو گیا ٹھیک ہے، پر بختو کو چھوڑ دے۔

رفیق نے شمشیر کی زندگی سی آواز سُنی تو اُس نے بختو کو چھوڑ کر باڑے کی طرف بھگا دیا اور چارہ لے کر گھر آ گیا۔ شمشیر نے بختو کو دیکھا تو جان میں جان آئی۔ اُس نے چارے پر لعنت بھیجی، بختو کو گود میں لیا اور دوبارہ بےفکر ہو کر سو گیا۔

شمشیر صبح اُٹھا تو نیند کا نشہ ہرن ہو چکا تھا اور رات کا واقعہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ اُس نے خجالت سے بچنے کے لیے فیکے کے ساتھ کھلا اعلانِ جنگ کر دیا اور کہا، اِس بختو کی اور میرے باپ کی قسم، آج سے مجھ پر لسی حرام ہے جب تک فیکے کو قتل نہ کر دوں۔

ایک شخص ہمت کر کے بولا، شمشیر خاں بختو کی قسم تو خیر ٹھیک ہے لیکن تمہارا ابا تو دس سال پہلے ہی بیل نے سینگ مار کے مار دیا تھا، اُس کی قسم کیسے ہو گئی؟

شمشیر خاں نے جواب دینے کی بجائے اُسے ایک اُلٹے ہاتھ کی دھول جمائی۔

....

شمشیر باڑے سے سیدھا صادق لوہار کی دوکان پر پہنچا۔ دوکان کیا تھی، کیکر کی لکڑی کے چار ستونوں پر بانس کے ٹکڑے ڈال کر ایک چھپر سا کھڑا کر لیا تھا۔ اس کے نیچے آگ کی بھٹی، مختلف لوہے کے اوزار اور دس بارہ موڈھے پڑے رہتے۔ صادق دھونکنی کے پہیے کو چکر دیتا رہتا اور لوہا سُرخ کر کر کے کوٹتا رہتا۔ بعض دفعہ وہاں بیٹھا کوئی نہ کوئی چکر گھمانے میں صادق کا ہاتھ بٹا دیتا۔ دوکان پر سارا دن گاؤں کے دس بارہ لوگ بیٹھے سمندر پار کی ہانکتے۔ ان میں بوڑھے، جوان، ادھیڑ عمر، سبھی ہوتے۔ بوڑھے زیادہ ہوتے۔ صادق کی دوکان پر رونق کی سب سے بڑی وجہ وہاں ہر وقت جلتی آگ تھی، جس کے تازہ اور موٹے انگارے اتنے خوبصورت تھے کہ اُنہیں کھانے کو دل کرتا۔ مفت کی آگ اور تازہ حقہ اتنی آسانی سے کہیں میسر نہیں تھا۔ اس لیے جو خبر

یہاں آتی، ہوا کی طرح گاؤں میں پھیل جاتی اور اُس وقت تک اُس پر تبصرہ چلتا جب تک اُس سے بڑی خبر اُس کی جگہ نہ لے لیتی۔

پچھلے چار دن سے گاؤں میں شمشیر اور رفیق کی شرط ہی زیرِ بحث تھی۔ ہر شخص پُر جوش تھا۔ کچھ اندازہ نہیں تھا، کیا ہونے والا ہے۔ دونوں برابر جوڑ کے سورمے تھے۔ بس اتنا تھا کہ شمشیر ذرا عقل کا موٹا تھا۔ ہر ایک تذبذب میں تھا، دیکھیں کیا ہو؟ صبح جیسے ہی یہ قصہ صادق لوہار کی دوکان پر پہنچا اور واقعہ نگار نے خوب نون مرچ لگا کر شمشیر کی خجالت بیان کی تو سب دنگ رہ گئے اور بحث چھڑ گئی کہ شمشیر کی مونچھیں کاٹنے کے لیے کون سی گدھی کا دودھ اور کس نائی کا اُسترا ٹھیک رہے گا۔ حقے کے دھویں کے سائے میں تجویزیں پیش ہونے لگیں۔ اتنے میں اُنہیں شمشیر آتا دکھائی دیا۔ اُسے دیکھ کر سب نے خموشی اختیار کر لی اور بیٹھنے کو جگہ دی اور ایسا تاثر پیش کیا کہ اُن کو کسی بات کا پتا نہیں۔ شمشیر نے موڑھے پر بیٹھنے سے پہلے ہی بڑے غصے میں صادق کو مخاطب کیا، اوئے صادق، ہتھوڑے کو نیچے رکھ اور میری بات سُن، مجھے دس انچ چوڑے پھل کی کلہاڑی چاہیے، ودیگی لوہے کی، وزن اُس کا دس سیر سے کم نہ ہو، تین فٹ لمبے توت کے دستے کی۔ یہ کلہاڑی آج شام تک مجھے ہر صورت چاہیے۔

حکم دیتے ہوئے شمشیر کے تیور اتنے بجز کیلے تھے کہ سب حواس باختہ ہو گئے اور کسی کو شمشیر سے پوچھنے کی طاقت نہ رہی کہ فیکے کے ساتھ کیا بنا؟ صادق لوہار نے ہمت کر کے پوچھا، خیر ہے بھائی شمشیر، اتنے غصے کی کیا بات ہو گئی؟ کلہاڑی کیا کرنی ہے؟

کیا کرتے ہیں اس طرح کی کلہاڑی سے؟ تجھے نہیں پتا؟ شمشیر گرج کے بولا، مجھے لدھو بن کے دکھاتے ہو۔

تم نہیں بتاؤ گے تو کیا مجھ پر وحی اُترے گی؟ صادق نے ترکی بہ ترکی کہا۔

فیکے کا کریا کرم کرنا ہے۔ اس کلہاڑی سے اُس کا سر تن سے جدا کر کے چوک والے کنویں کی مہال سے لٹکانا ہے اور سب کو دکھانا ہے کہ شیر اپنے کہے سے نہیں نکلتے۔ شمشیر نے یہ جملے اتنی کرختگی سے ادا کیے کہ سب گھبرا گئے۔ اُنہیں گدھی کا دودھ اور اُسترے بھول گئے۔

اُسے کیوں قتل کرنا ہے، کوئی وجہ تو ہو گی؟ صادق لوہار نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

بس ایسے ہی، مرد وجہ نہیں بتاتے، شمشیر نے دوٹوک جواب دیا۔

لیکن وہ تو تیرا یار تھا، یہ ایک دم کیا ہو گیا؟

یار تو تھا لیکن صادق میاں، میں نے سوچا، دو شیر ایک جنگل میں نہیں رہ سکتے۔ اس لیے اب اُس کا مکو ٹھپ ہی دینا چاہیے۔ بس تُو آج ہی ایک ستھری سی کلہاڑی بنا دے۔ اب فیکے کی آ گئی ہے تو شمشیر خاں کیا کر سکتا ہے؟

ایک شخص جو وہاں بزرگ قسم کا بیٹھا تھا، ہمت کر کے بولا، شمشیر خاں ذرا ہوش کر، لڑائی بھڑائی ہوتی رہتی ہے۔ فیکا دل کا بُرا نہیں، اتنا غصہ نہ کھا، ٹھنڈے دل کے ساتھ فیصلہ کر، ویسے اُس نے کام اچھا نہیں کیا۔

چاچا نیاز دین، شمشیر گرجا، اس سے تیری صلاح لینے کا وقت نہیں۔ یہ مشورے تُو فیکے کی قبر کھودنے والوں کو دینا کہ پترا اتنے گز لمبی کرو اور اتنے ہاتھ چوڑی۔ اس وقت میرے ہاتھ پر نہ بول، یہ جوان مردوں کے کام ہیں، بڈھوں کے نہیں۔

نیاز دین شمشیر کی جھڑک کھا کر چُپ ہو گیا۔ اس کے بعد کسی کو بات کرنے کا حوصلہ نہ رہا لیکن دل ہی دل میں سب خوش تھے کہ اب ان کی جنڈی پھنسی کہ پھنسی۔ آدھ گھنٹا سمجھانے اور دس روپے صادق کو پیشگی دینے کے بعد شمشیر چلا گیا۔

رفیق جب صبح دوبارہ شمشیر خاں کے باڑے پر گیا تو وہاں صرف نوکر تھا۔ اُس نے بتایا، شمشیر صبح ہی چلا گیا ہے اور بہت غصے میں ہے۔ جاتے جاتے میرے بھی ایک دھول جما گیا ہے۔

کچھ دیر بعد لوگوں نے رفیق کو بتا دیا کہ شرط تو ایک طرف رہی، شمشیر صادق لوہار کو کلہاڑی بنانے کی پیشگی دے آیا ہے۔ رفیق سُن کے ہنس دیا اور گھر چلا آیا۔

کلہاڑی بن کر آئی تو شمشیر کے ایک ہاتھ میں بختو کی زنجیر اور دوسرے میں یہ خونخوار قسم کی کلہاڑی رہنے لگی۔ ہر کوئی چمکتی ہوئی ننگی کلہاڑی دیکھ کر دُور سے ہی رستہ بدل لیتا لیکن اب شمشیر کھلے بازار میں کسی نہ کسی کو پکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور اُسے فیکے کے آیندہ ہونے والے قتل کے بارے میں تفصیل سے بتاتا۔ ایک ایک پہلو پر سیر حاصل گفتگو کرتا اور افسوس کرتا کہ ایک اچھا بھلا جوان خواہ مخواہ اس دنیا سے اُٹھ جائے گا۔ سامنے والا فرد بھی شیرے کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ دو تین روز اسی طرح گزر گئے۔

اسماعیل تیلی نماز کے لیے نکلا۔ عصر کی اذان ہوئی تھی اور اُس نے باجماعت نماز میں

شریک ہوتا تھا۔ شمشیر کا گھر مسجد کی راہ میں تھا۔ اس نے گھر سے نکلتے ہی اسماعیل کو آتے دیکھا تو سڑک پر ہی روک کر کھڑا ہو گیا۔ بختو کی زنجیر کلہاڑی والے ہاتھ میں پکڑ لی اور زنجیر والا ہاتھ اسماعیل کی طرف بڑھا دیا۔ اسماعیل بے چارا نمازی اور پرہیز گار بندہ، کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ سلام لیتا ہے تو ہاتھ پلید ہوتا ہے، نہیں لیتا تو ایک نئی مصیبت۔ آخر دل ہی دل میں خدا سے معافی مانگی اور ہاتھ ملا لیا۔ اُس کے بعد شمشیر نے وہی فیکے والا قضیہ چھیڑ دیا۔

چاچا اسماعیل، اب تُو ہی بتا، کیا کیا جائے فیکے کے معاملے میں؟

اسماعیل...... بھئی میری تو صلاح ہے اُسے معاف کر دے۔

شمشیر...... یہ تو نامردوں والا مشورہ ہے۔

اسماعیل...... تو پھر صلاح کس چیز کی مانگتا ہے؟

شمشیر...... یہی کہ اُسے کس چیز سے قتل کروں؟ آخر تم سیانے آدمی ہو، بڑا زمانہ دیکھا ہے۔

اسماعیل...... میاں، مَیں نے زمانہ تو دیکھا ہے پر قتل تو نہیں کیے۔

شمشیر...... قتل نہیں کیے لیکن اُجاڑے میں قتل ہوتے تو دیکھے ہیں کہ نہیں؟ بس یہ بتا دے، آسان موت کس ہتھیار سے ہوتی ہے؟

اسماعیل...... دیکھ شمشیر! ایک تو یہ کہ اُجاڑے میں نہیں دیکھا جاتا تھا، کافر کو کس شے سے مارا جائے کہ اُسے تکلیف کم ہو، دوسری بات یہ کہ تم نے یہ کلہاڑی کس لیے بنوائی ہے؟

شمشیر...... فیکے کو قتل کرنے کے لیے۔

اسماعیل...... جب تم ایک ہتھیار بنوا چکے ہو تو پھر مشورہ کیا دوں؟

شمشیر...... لو یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ اچھا یہ بتا دو، کلہاڑی کس جگہ ماروں کہ اُسے درد بھی نہ ہو اور وہ فوراً مر بھی جائے۔ ذرا تجربے سے بتاؤ۔

اسماعیل...... شمشیر کس طرح کی باتیں کرتے ہو؟ تجربے سے تب بتاؤں، جب میں نے کسی کو مارا ہو۔ مَیں نے تو آج تک چوہا نہیں مارا۔ پھر جب تُو نے اُسے مارنا ہی ہے، تو اُس کی تکلیف سے کیا مطلب؟

شمشیر...... واہ چاچا اسماعیل واہ، فیکا آخر میرا یار ہے۔ اُسے تکلیف ہو گی تو کیا مجھے تکلیف نہ ہو گی؟ تم نے دلیروں والی بات نہیں کی۔

اشکے بھئی اشکے، اسماعیل نے حیران ہو کر کہا، تیرے جیسے قاتل میں نے پہلی بار دیکھے ہیں، جو اونٹ پر بیٹھ کر کوہان سے ڈرتے ہیں۔ بھئی اگر تم کو اس کا اتنا ہی احساس ہے تو قتل ہی کیوں کرتا ہے؟ بس جانے دے، جو ہوا سو ہوا، اس کا درد نہیں دیکھنا چاہتا تو اتنے کڑیل جوان کو مارتے ہوئے تجھے رنج نہیں ہوگا؟

افسوس تو مجھے بھی ہے اس بات کا چاچا، شیر جیسا جوان چھوٹی سی بات پر مرنے لگا ہے، پر کیا کروں؟ آخر زبان دے بیٹھا ہوں۔ ویسے بھی سب نے ایک دن چلے تو جانا ہے۔ کوئی دو دن آگے، کوئی دو دن پیچھے، یہ دنیا فانی ہے۔

بھئی میری نماز چھوٹی جا رہی ہے کوئی فیصلہ کرو۔ اسماعیل نے تنگ آ کر کہا۔

جا چاچا نماز پڑھ، کہیں تیری جنت نہ ہاتھ سے نکل جائے۔ حد ہو گئی، تم لوگوں کو بندے کی جان کی پروا نہیں، نمازوں کی ہے، جا چلا جا۔ غصے سے، اگر فیکا مر گیا تو دیکھوں گا اللہ تیری نمازوں کو کس کھاتے میں ڈالتا ہے۔ اِن نمازوں کے ساتھ ہی دوزخ میں جائے گا۔ شمشیر نے بختو کی زنجیر دوبارہ دائیں ہاتھ میں لی اور راستہ چھوڑ دیا۔

اُدھر فیکا اپنے کام میں لگا رہا۔ اُسے اُس کے بڑے بھائی بشیر احمد نے سختی سے منع کر دیا کہ فی الحال شمشیر سے دور رہو۔ خواہ مخواہ دنگا مچانے کی ضرورت نہیں۔ بھائی کے کہنے پر وہ شمشیر کے سامنے آنے سے گریز کرتا رہا۔ شمشیر نے جب دیکھا کہ فیکا میرے سامنے نہیں آتا تو مزید بڑھ چڑھ کر اس کے قتل کے تذکرے کرنے لگا۔

ایک دن رفیق کا بھائی شمشیر کو سامنے سے آتا دکھائی دیا، تو شمشیر نے اُسے سلام کیا اور بولا، بائی، اپنا فیکا شیر کدھر ہے؟ کئی دن سے نظر نہیں آ رہا؟

اِدھر گاؤں میں ہی ہے، رفیق کا بھائی بولا، بس بھینسوں کے چارے وارے میں لگا رہتا ہے۔ کیوں، کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟

خیر ہی تو نہیں ہے بائی بشیر۔ بس قسم کھا بیٹھا ہوں اُسے قتل کرنے کی۔

ایں، خیر، بشیر نے حیرانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا، شمشیر خاں تیرے ہوش تو ٹھکانے پر ہیں؟ کل تک ایک دوسرے کا لقمہ بچاتے تھے۔ ٹھرا تو نہیں چڑھا رکھا؟

بائی ٹھرے میں نہیں ہوں، شمشیر نے لجاوٹ سے کہا۔

یہ اچھی بات تو نہیں ہے۔ بشیر تحمل سے بولا، اگر وہ میرا بھائی ہے تو تیرا بھی یار ہے، اُسے قتل کرنے سے تیرا اور میرا نقصان تو برابر ہی ہوگا۔

بائی، بات تیری ٹھیک ہے، پر کیا کروں؟ اُسے قتل کرنے کی زبان دی ہوئی ہے۔ بس اُسی کے ہاتھ سے مجبور ہوں۔ مجھے غصہ آیا ہوا ہے، اب تو یہ کڑوا گھونٹ بھرنا ہی پڑے گا۔ بس اللہ سے اُس کی بخشش کی دعا مانگ۔

بشیر...... میں تو اُس کی زندگی کی دعا مانگوں گا۔

شمشیر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا، اس کا ایک طریقہ ہے۔ اِدھر کان نزدیک کر، اُسے کہو، چار چھ دن گاؤں سے آگے پیچھے ہو جائے۔ میرا غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو پھر آ جائے ورنہ نقصان بہت ہو جائے گا، دونوں گھروں کا۔

بشیر...... بات تو تیری ٹھیک ہے شمشیر خاں مگر تمھاری قسم کا کیا بنے گا؟

تُو اُس کی فکر نہ کر۔ خدا سے میں خود بات کراوں گا، یہ میرا اُس کا معاملہ ہے۔ بس کچھ دن کے لیے فیکا شیر یہاں سے چلا جائے تو کوئی حل نکل سکتا ہے۔

بشیر...... یہ طریقہ ٹھیک ہے شمشیر، میں آج ہی اُسے جھوک محسن بھیج دیتا ہوں مگر اِن بھینسوں کا کیا کروں؟ اگر وہ یہاں سے چلا جائے گا تو ان کو چارہ کون ڈالے گا؟ میرے تو بس کا روگ نہیں۔

شمشیر کچھ دیر سوچ کر دوبارہ بولا، اِس کا ایک حل ہے۔ اِنھیں میرے باڑے پر باندھ آؤ۔ میرا نوکر ان کو چارہ ڈال دیا کرے گا۔

بشیر،، یہ بات تم نے بہت عمدہ کی۔ میں کل صبح ہی رفیق کو گاؤں سے نکال کر بھینسیں تمھارے باڑے میں باندھ آتا ہوں۔

شمشیر نے خوش ہو کر مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ بختو کی زنجیر دوسرے ہاتھ میں کی اور آگے چل دیا۔

....

اگلے دن عصر کا وقت تھا۔ رفیق کام سے فارغ ہو کر، آرام سے چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اچانک باہر سے شمشیر کی آواز آئی، اوئے فیکے شیرا، ذرا باہر آ، ضروری کام آ گیا، جلدی آ جا۔

آواز میں کرختگی اور اکھڑ پن ویسا ہی تھا، جس کے سبب رفیق کا بھائی تذبذب میں پڑ گیا۔ رفیق باہر کی طرف لپکا تو اُسے روکنے کے لیے بشیر بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا! رفیق باہر مت جاؤ، مَیں پوچھتا ہوں، کیا چاہتا ہے؟

بائی بیٹھ جا، کوئی بات نہیں، مَیں خود دیکھتا ہوں۔ یہ کہہ کر رفیق بلا جھجک دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اُس کے پیچھے بشیر بھی دوڑا کہ کہیں ظالم کلہاڑی نہ مار دے۔

شمشیر کے ایک ہاتھ میں وہی صادق لوہار والی کلہاڑی اور دوسرے میں بختو کی زنجیر تھی۔ شمشیر خاں رفیق کو دیکھتے ہی بولا، بھئی فیکے شیرا، بات یہ ہے کہ اپنی بختو، کت، پر آ گئی ہے۔ سُنا ہے چک بیدی والا میں رنگ علی شاہ کا کتا بڑا نسلی ہے۔ جلدی تیار ہو، چک بیدی میں رنگ شاہ کے کتے سے بختو پر پھیرا لگوا لائیں۔

رفیق نے پلٹ کر پاؤں میں جوتے اڑسے، صافا سر پر رکھا اور شمشیر کے ساتھ چل پڑا۔

شمشیر نے بختو کی زنجیر اپنے ہاتھ میں رکھی اور کلہاڑی رفیق کو پکڑاتے ہوئے بولا، فیکے شیرا، یہ کلہاڑی تم پکڑو، کمبخت صادق لوہار نے دس کلو لوہا اسی پر لگا دیا۔ اسے پکڑے میرے تو بازو آدھے رہ گئے۔ اتنی بھاری کلہاڑی میرے ہاتھ تھما دی، بھلا کوئی پوچھے مَیں نے دلی فتح کرنی تھی؟

عصر کا سورج بائیں کاندھے پر تھا، دن کا اُجالا تھا، بادلوں کے گولے سروں پر اُڑ رہے تھے۔ اس عالم میں دونوں لنگوٹیے بختو کو لے کر گاؤں کے درمیان تیز قدموں سے نکل رہے تھے۔

جیرے کی روانگی

قصبے اور دریا کے بیچ قبرستان تھا۔ اب یہ دریا وہ نہیں تھا جس کا پاٹ کبھی ایک کلومیٹر تھا۔ اب تو یہ ایک نہر سے کچھ ہی بڑا تھا۔ اس کے بارے میں کئی روایتیں مشہور تھیں مثلاً ایک دفعہ یعنی آٹھ نو سو سال قبل پیر جتی شاہ دریائے بیاس کے کنارے بیٹھا تین دن تک ملاحوں کی منتیں کرتا رہا کہ اُسے پار اُتار دیں لیکن ملاح مان کے نہ دیے اور کہا کہ تب پار اُتاریں گے جب پیسے دو گے لیکن اللہ والوں کے پاس پیسے کہاں سے آئے۔ آخر تیسرے دن حضرت کو جلال آ گیا۔ دھوتی گھٹنوں سے اوپر کر لی اور دریا میں یہ کہہ کر قدم ڈال دیے کہ لو بھائی! نہ آج سے دریا رہے، نہ تم کشتیاں چلاؤ۔ پھر جیسے جیسے پیر جتی شاہ دریا میں آگے بڑھتے گئے پانی گھٹنوں گھٹنوں ہوتا گیا۔ پار اُترے تو دریا نہر کے جتنا رہ گیا۔ پھر تو ملاحوں نے باباجی کے آگے بہت ناکیں رگڑیں، ہزار منتیں کیں مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بھائی! تب سے وہ دریائے بیاس نہر ہی بہتی ہے، جس کا پاٹ دو سو میٹر رہ گیا اور گہرائی فقط سات آٹھ فٹ کی۔ مگر یہ سات آٹھ فٹ گہری اور دو سو میٹر چوڑی نہر بھی اطراف کے باسیوں کے لئے کم غنیمت نہیں تھی۔ مثلاً ہمارے ہی قصبے کو لیجیے، ہر طرف باغ و بہاری کا عالم تھا۔ جدھر نظر پڑتی، سبزہ اور چراگاہیں ہرا ہرا بکھیر تیں۔ دونوں کناروں پر دور تک سرسبز و شاداب کھیت، ٹھنڈی زمینیں اور ہرے بھرے باغات پھیلے تھے۔ شیشم، نیم، شریںہ، پیپل اور برگد کے پیڑوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ ٹھنڈے سائے اور نم ریلی ہوائیں غنودگی پھیلاتے۔ قصبے کا انحصار زراعت پر تھا۔ روشوں پر قطار در قطار سینکڑوں جامنوں کے درخت چلے جاتے تھے۔ مال مویشی بے انت تھا۔ مچھلی کا شکار ایسا کہ جس کا جی چاہا دریا میں جال ڈال کر پکڑ لایا۔ بعضوں نے کوشش کر کے چھوٹی چھوٹی نہریں نکال لیں اور دور تک کی زمینوں کو سیراب کرنے

گئے۔ قصبے کی عورتیں کپڑے بھی وہیں آ کر دھوتیں اور کھلے پانی میں خود بھی نہاتیں۔ جمعہ کے جمعہ تو کناروں پر ناریوں کی ڈاریں جاتیں اور ارد گرد سے بے نیاز، تھپا تھپ کپڑے دھوتی نظر آتیں، جن کی تنگ چولیاں بھیگ کر عجب بہار بناتیں۔ لڑکوں بالوں کی تفریح تو گویا دریا کے سبب ہی تھی۔ نیکریں پہنے ہر وقت دھما دھم ڈبکیاں لگاتے۔ دریا کیا تھا نہر شداد تھی کہ بہے جاتی ہے اور سیراب کئے جاتی ہے۔

مگر ایک قباحت اس میں ضرور تھی کہ ہر سال دو ایک آدمی ڈوب کر مر جاتے۔ میرے ہوش میں تو کوئی ایسا سال نہیں گزرا تھا جس میں کوئی آدمی ڈوب کر نہ مرا ہو۔ دریا پر کسی زمانے میں ایک پل بنا دیا گیا تھا لیکن وہ پل فقط ایک پگڈنڈی تھا جس کے نیچے پانی ذرا گہرا تھا۔ کوئی نہ کوئی بے احتیاطی میں ضرور گر جاتا اور اللہ کو پیارا ہو جاتا۔ ساون بھادوں کے دنوں میں تو اکثر پل بھی ڈوب جاتا، پھر دو ڈھائی مہینے کشتیاں چلتیں۔ ہم لڑکے بالے، جن کا ہر وقت دریا سے واسطہ رہتا، وہ تو اس کی اونچ نیچ سے واقف تھے لیکن سال میں ایک دو اجنبی ضرور ڈوب مرتے۔ اس لئے یہ بات مشہور ہوگئی کہ بیاس سال میں ایک دو انسانوں کی قربانیاں لیتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ ہر ایک کا عقیدہ بن گیا۔ ایک سال جب نہر نے پوری دس قربانیاں لیں تو پورے علاقے میں کہرام مچ گیا۔ بات یہ تھی کہ ہمارے قصبے میں ایک بڑا اسکول تھا۔ اس میں پڑھنے والے لڑکوں کی تعداد کوئی پانچ سو کے لگ بھگ تھی۔ جس میں قصبے والوں کے علاوہ ارد گرد کے گاؤں سے بھی لڑکے آ کر پڑھتے تھے۔ ساون بھادوں کے دن تھے، بارشیں اتنی ہوئیں کہ بیاس کا پاٹ دو سو میٹر سے بڑھ کر تین سو تک ہو گیا اور گہرائی بھی دس بارہ فٹ تک چلی گئی۔ پار گاؤں کے لڑکے کشتی میں سوار چلے آتے تھے کہ اچانک کشتی اُلٹ گئی اور دس لڑکے ڈوب کر مر گئے۔ بات پھیلی تو حکومت نے ایک بڑے پل کی منظوری دے دی، جو ساڑھے تین سو میٹر لمبا اور پچیس فٹ اونچا تھا۔ یہ پل دو سال میں بن کر مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد حادثات میں کمی ہوگئی۔ اب ساون بھادوں میں بھی پانی کبھی اتنا نہ ہو سکا کہ پل کی نچلی سطح کو چھو لیتا۔ یوں وقت خیریت سے گزرنے لگا اور ڈوب مرنے کے حادثے ختم ہو گئے۔

☆

پورے قصبے میں ڈھنڈورا پٹ گیا کہ آج چاچا جیرا جانی چور کا قصہ سنائے گا۔ لوگ سنتے

گئے اور خوشی خوشی شام ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ سال پہلے کی لن ترانیاں آنکھوں میں گھوم گئیں۔
جیرے نے رضیہ سلطان کی پٹا اور جانی چور کے معرکے بیچ چوراہے دکھائے تھے۔ ایک بات سب کی سمجھ میں نہ آئی، آخر جیرا قصہ جانی چور سنانے پہ تیار کیسے ہوا کہ اس سے پہلے سینکڑوں کی آفریں کیں لیکن اُس کی اپنی ایک ہی ''نہ'' تھی جو کسی صورت ''ہاں'' میں نہ بدلی تھی۔ چائے خانوں سے لے کر جوا خانوں تک، حیرانی کا دورہ تھا۔ طنبو کے ہوٹل میں دوپہر سے یہی ذکر تھا، جب اُس نے دودھ میں گڑ چھالاتے ہوئے کہا، بھائی سیف دین! مَیں تو ایک جانتا ہوں، جیرے میں لاکھ عیب سہی مگر ہے وہ خالص ہیرا۔ مَیں نے تو اماں جان کی قسم، اُس سے کبھی چائے کے پیسے نہیں لیے، چاہے ملائی والی پیے، چاہے تیز پتی کی اور دودھ جلیبی بھی ضرور کہہ کے مفت کھلاتا ہوں۔ بھائی سب جانتے ہیں، مَیں نے اُس کی ہمیشہ قدر کی ہے۔

بیٹھ جا طنبو، سیف دین چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا ''مَیں جانتا ہوں تیری سیاست کو۔ تیرے جیسے چتر کار تو مفت میں چوزے کا بال نہیں دیتے۔ رہا تُو جیرے کو مفت جلیبیاں اور ملائی کی چائے پلانے والا۔ اصل میں تُو جانتا ہے، جب تک جیرا تیرے ہوٹل پر بیٹھا رہتا ہے اتنی دیر رونقیں لگی رہتی ہیں۔ چائے کے بیسیوں کپ ویسے ہی بک جاتے ہیں۔ اگر وہ جانی کے ہوٹل پر بیٹھنے لگے تو یہاں مکھی واسوں کے ٹھٹے بھونکیں۔ ایک کپ جیرے کو مفت میں پلا کر اُس پر احسان جتاتا ہے۔

طنبو حلوائیا بات بدل کر بولا، سیف الدین یہ انقلاب کیسے آیا کہ جیرا قصہ سنانے پر راضی ہو گیا۔

بس جی من موجی ہے۔ نہ سنائے تو سردار کمال احمد اور ڈپٹی صاحب کے ڈرانے پر بھی نہ سنائے، اگر دل میں آئے تو بغیر کہے مجمع لگا دے۔ سیف دین نے اب کے دھیرج سے جواب دیا۔

نہ بھائی یہ بات نہیں، قریب سے غلام علی بولا۔

پھر کیا بات ہے؟ سیف الدین نے تنگی سے پوچھا، کیا اُس نے تیری اماں کا کہا مان لیا؟ جس کے گھگرے کے پلو گلیوں میں جھاڑو پھیرتے جاتے ہیں اور تالے سے بندھی چابیوں کے گچھے جھانجھریں بجاتے ہیں۔

میاں سیف! میری اماں کے گگھرے کا جیرے سے کیا تعلق؟ بات چاہے کسی کی ہو، تم

نے گھوم پھر کے دل شاپ کرتا ہے۔

اچھا اچھا اب زیادہ لمبا نہ ہو اور سیدھی طرح بتا، کیوں جیرا جانی چور کا قصہ سنانے پر راضی ہوا؟

حضور یہ سب پیر مودے شاہ کی کرامت ہے، غلام علی نے پہلو بدل کر کہا، کل ہم سب پیر مودے شاہ کی سرکار میں بیٹھے تھے۔ وہاں جیرے کی قصہ خوانی پر بات چھڑ گئی۔ مودے شاہ نے کہا بھئی اُسے تو ہم بھی سُنیں گے۔ ہم نے کہا، حضور جیرا قصہ سنانے پر راضی نہیں ہوگا، اپنی مرضی کا مالک ہے۔ باباجی کو اُسی وقت جلال آ گیا۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئیں اور تھر تھر کانپنے لگے۔ بولے، جیرے کی کیا اوقات ہمیں قصہ نہ سنائے، جلا کر راکھ کر دیں گے۔ کل شام قصہ خوانی کا انتظام کرو، ہم دیکھیں گے کیسے نہیں آتا۔ اللہ جانتا ہے، مَیں وہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں جیرا بھاگا آیا، بولا، حضرت مَیں آپ کے حضور قصہ جانی چور پڑھنا چاہتا ہوں۔ اتنی سی بات ہے۔

اچھا تو یوں کہو، پیر مودے شاہ کا کمال ہے۔ طیفو حلوائیا جلیبیاں میٹھے میں پھینکتے ہوئے بولا مَیں بھی کہوں، یہ انہونی کیسے ہوگئی۔

ہوں! تو یہ بات ہے۔ بھئی پیر مودے شاہ کی کرامت میں تو کوئی شک نہیں۔ دن کو رات کہے تو فوراً رات ہو جائے۔ بس پھر یہی بات ہے۔ سیف دین کی تنگی فوراً دور ہوگئی۔

لو بس بھئی بات کھل گئی۔ مَیں بھی کہتا تھا، کچھ کہیں راز ہے۔ اب کہانی صاف ہوئی، جمال خاں تنکے اور روئی کے ذریعے کان سے میل نکالتے ہوئے بولا۔

افضال نے گفتگو میں حصہ لیا، لو بھائی اب کس کو بھول ہے۔ تمہیں یاد نہیں؟ دین محمد کے گھر اولاد نہیں ہوتی تھی۔ اُنہوں نے مودے شاہ سے عرض کی، باباجی! صحت مند اور موٹی تازی اولاد چاہیے۔ حضرت نے کہا، اگلے برس تمہارے بیٹا ہوگا۔ قدرت خدا کی دیکھو، اُسی رات حمل ہو گیا۔ اب ایک اور تماشا ہوا، دین محمد کی بیوی کہنے لگی یہ تو میرے پیر رنگ شاہ کی دین ہے، اُسی کی دعا سے ہوا۔ مودے شاہ کا کوئی کمال نہیں۔ دین محمد نے لاکھ سمجھایا، اللہ کی بندی ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ یہ سب مودے شاہ کی کرامت ہے۔ وہ نہ مانی۔ آخر دین محمد نے یہ بات مودے شاہ کو بتا دی۔ حضرت کو فوراً جلال آ گیا۔ فرمانے لگے، اگر حمل اُس کے پیر کی دعا سے ہوا ہے تو اُسے کہو کہ اب وہ پیدا کر کے دکھائے۔ پھر خدا گواہ ہے تین سال تک بچہ پیدا نہ ہوا۔ بچاری حمل اُٹھائے

اُٹھائے پھرتی تھی۔ آخر قدموں میں آ گری، تب جا کر لڑکا پیدا ہوا۔ بھئی اللہ والوں کو ناراض کرنے سے یہی کچھ ہوتا ہے۔

الغرض اسی طرح کی خیال آرائیاں پورے قصبے میں عشا تک ہوتی رہیں۔ اُدھر شام ہی سے یونین کونسل کے بڑے ہال میں کوئلے دہکا کر انگیٹھیاں روشن کر دی گئیں۔ پیر مودے شاہ کی چارپائی شاہی تخت کی طرح لگ گئی۔ جس پر سفید چادریں بچھی تھیں اور ریشمی تکیہ سنہری موج مارتا تھا۔ بڑے ہال میں چونکہ صرف تین سو کرسیاں تھیں اس لئے کرسیاں باہر نکال کر ہال میں پیال بچھا دی گئی تاکہ کم از کم پانچ سو آدمیوں کی گنجائش پیدا ہو جائے۔ ہر آدمی اتنا پر جوش تھا جیسے سونے کی کان ہاتھ آ گئی ہو۔ سب انتظام مکمل ہو گئے۔ ہال میں ایک سناٹے کا راج ہو گیا کہ اچانک چاچے جیرے کی آواز گونجی۔

سارو ماتا ایشری کرت نمو کئی بار
ہاتھ جوڑ کے عرض کراں لیو ہماری سار

اور پھر

آن کھڑے میدان وچ سورے، ہتھ وچ کمان تے بان پھڑ کے
لیاں پکڑ کٹاریاں جُودھیاں نے، پئے گرجدے وچ میدان کھڑ کے
ہنو وانگ للکاردے کھڑے سارے، سُور بیر جو میگھنے وانگ کھڑ کے
مارو مار میدان دے وچ ہوئی، جانی چورنا گیا سی پھیر چڑھ کے
سارے ہوئی قتام کشور چندا، سور بیر کھڑو گئے کل اڑ کے

جیرے نے کچھ دیر تو اسی طرح اشعار میں آہستہ روی سے قصے کو آگے بڑھایا۔ مجمع ہمہ تن گوش واقعات کے پلٹنے کا منتظر تھا۔ لوگ جانتے تھے، قصہ جیرے کی زبان پر کیسے قلابازیاں کھاتا ہے کہ میدان جنگ اُٹھا کر مجمعے کے بیچ میں رکھ دیتا ہے۔ ہر شخص اس موقعے کا انتظار کرنے لگا کہ اچانک جیرے نے لہجے کے تیور بدلے اور بدھ سنگھ کی فوج کو راجپوتوں سے بھڑا کر جانی چور کے بیان کو اُٹھا لیا۔

بدھ سنگھ دی فوج دا رتن سنگھ سی جوان
پکڑ کٹاری ہاتھ میں وڑیا وچ میدان

پہلا ہتھ آن جانی تے اُٹھالیا...... چورنے نے انگ آپڑا بچا لیا
چیندے للکارے اندر میدان دے...... کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان دے
پھر جانی چورنا چلاوے سٹ نوں...... مار کے کٹاری کھول دا ہے پھٹ نوں
ہوگئی ہے گردموہرے آن بھان دے...... کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان دے
بھوندیاں پھرن اُتے کل جوگناں...... اج راجپوتاں نوں پوے گا بھوگناں
اندرکھڑک کرن نہ میان دے...... کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان دے
اکھاں وچوں چل گئے پرنالے رت دے...... اُڈنے نے سیس جی سمان پت دے
سورے گرج رہے سلطان دے...... کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان دے
چھچھڑ اٹھائی پھر دی ہے کاکا...... بوندی گڑھ وچ چھڈ نانی باکا
چار بُت مارے رحمت پٹھان دے...... کٹ گئے نے سر سینکڑے جوان دے

الغرض مجمعے کے درمیان میں بانس کی چھڑی پکڑے جیرا کبھی اس طرف اور کبھی اُس طرف چلتا اور آواز کے نشیب وفراز سے کہانی کو پلٹے دیتا رہا۔ کبھی عین جانی چور بن جاتا، اپنی چھڑی کو تلوار کی شکل میں ایسے گھماتا کہ دیکھنے والے کو ایک ماہر تلوار باز نظر آتا اور کبھی رضیہ سلطان کی نقل میں شاہی حکم صادر کرتا، اُس وقت لہجے کا طنطنہ عین بادشاہوں کی صورت اختیار کر لیتا۔ اسی طرح رات تین کا عمل ہوگیا۔ مجال ہے، کسی نے ہلنے اور کان پر کھجلی کرنے کی بھی ہمت کی ہوتی کہ تین بجے جیرے نے اچانک داستان روک دی۔ مجمع طلسم سے باہر نکلا اور پیر مودے شاہ بھی ہوش میں پلٹا۔ جیرا ابھی سنبھل کے اور ہاتھ باندھ کے کھڑا ہی تھا، اُسی وقت پیر مودے شاہ کی آواز گونجی، جیرے مانگ کیا مانگتا ہے؟

جیرے نے ویسے ہی ہاتھ باندھ کے کہا، حضور یہ قصہ تو آپ کی محبت میں عرض کیا، زر کی حاجت نہیں۔

پھر بھی آج جو مانگے گا، دیں گے۔ مودے شاہ دوبارہ گرجا۔

سرکار اگر انکار کر دیں گے تو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ جیرا تھوڑا سا جھجکا۔

جیرے ہماری توہین مت کر۔ ہم میں خدائی صفات ہوتی ہیں۔ پیر صاحب جلالی لہجے میں دھاڑے۔

حضور! اس میں کیا شک ہے کہ آپ صاحب کرامت ہیں، اب جیرا نزدیک ہو کر محکم آواز میں بولا، بابا جی! گدھے پر سواری کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔ اگر ایسے ہی اصرار ہے تو آپ کی سفید گھوڑی دل کو بھا گئی۔ آپ کی کرامت سے بیسیوں ایسی گھوڑیاں اور آ جائیں گی، پر مجھے آپ یہ دے دیجیے، بڑا کرم ہوگا۔

جیرے کا گھوڑی مانگنا تھا کہ مودے شاہ سمیت سارے مجمعے کو سانپ سونگھ گیا۔ مودے شاہ کے چہرے پر تو ایک قسم کی سیاہی پھر گئی اور وہ ہونقوں کی طرح جیرے کو دیکھنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو کہ پورے قصبے کا مزہ کرکرا کر دیا۔ لوگوں میں ڈر کے مارے کھسر پھسر ہونے لگی۔ وہ جیرے کی اس قدر بد تہذیبی اور دیدہ دلیری سے ڈر گئے لیکن جیرا استقلال سے کھڑا ہوا تھا اور ذرا بھی اپنی جسارت سے شرمندہ نہیں تھا۔ دوسری طرف مودے شاہ کی حالت یہ تھی کہ اُس کے لئے اب گھوڑی دیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ پورا مجمع مودے شاہ کی سخاوت کی للکار سن چکا تھا۔ بالآخر کچھ دیر سوچ کر مودے شاہ نے جیرے کو گھوڑی دینے کا اعلان کر دیا۔ اب قصبہ والوں کو جیرے کی چال کا پتہ چلا اور وہ اس بات پر حیران ہوئے کہ آخر اُس نے پیر صاحب کو بھی نہیں چھوڑا۔

اصل میں جیرے کے بارے میں قطعی تو کسی کو پتہ نہیں تھا کہ کس قبیلے کا ہے مگر بیس سال سے اسی قصبے میں تھا۔ سنا ہے اُس کا والد چھوٹا موٹا زمیندار تھا جس نے اس کے کرتوتوں اور آوارگی کے سبب اسے عاق کر دیا۔ تب سے گھر سے نکلا اور پھر نہ گیا۔ سواری کے لئے اس کے پاس گدھا تھا، جس کی بدولت اس نے دور و نزدیک کی منزلیں طے کیں اور قصبہ قصبہ پھرا۔ چھ چھ مہینے غائب رہتا، پھر لوٹ آتا اور جیسے ہی قصبے میں داخل ہوتا، ایک قسم کی رونق پیدا ہو جاتی کیونکہ اُسے بہت سی داستانیں اور قصے کہانیاں یاد تھیں، جنہیں وہ ایسے سلیقے سے سناتا کہ لوگ سر دھنتے رہ جاتے۔ ڈھول بادشاہ، قصہ شاہ داؤد، داستان امیر حمزہ اور قصہ جانی چور تو اُس کی دل پسند کہانیاں تھیں، جو اُس نے قصبے والوں کو سنا کر اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ علاوہ ان داستانوں کے، جیرا اپنے سفر کے واقعات بھی جھوٹ سچ کا تڑکا لگا کر اس طرح سناتا کہ ہر شخص اپنا قرض بھول جاتا۔

اس کا قصبے سے نکلنے کا سبب بھی وہ دو چار سو روپے قرض ہوتا، جو وہ قصبے کے کسی آدمی سے لے لیتا۔ قرض واپسی کے تقاضے بڑھتے تو کسی دوسرے سے لے کر پہلے آدمی کا چکتا کر دیتا۔ اگر یہ نہ کر سکتا تو قصبہ چھوڑ دیتا، پھر جب تک جیرے کی واپسی ہوتی، قرض خواہ اپنے قرض سے

دست بردار ہو چکا ہوتا۔ اوّل اوّل تو قصبہ والوں کو حیرانی تھی کہ جیرا آخر لوگوں سے اتنا قرض کیوں لیتا ہے لیکن تھوڑے ہی عرصے میں یہ معما حل ہو گیا۔ بات یہ تھی کہ آدھا قصبہ خود جیرے کا مقروض تھا یعنی کسی کو سو پچاس کی ضرورت پڑتی تو وہ جیرے کو ڈھونڈتا ہوا آ پکڑتا۔ یہ خدا کا بندہ اُسے خالی لوٹانے میں توہین خیال کرتا اور اِدھر اُدھر سے مانگ کر اُس کے حوالے کر دیتا۔

جیرے کو پہلے پہل تو ان کاموں میں کوئی وقت نہ ہوئی کہ لوگ باتوں کے چٹخارے میں آجاتے تھے مگر آہستہ آہستہ اعتماد خراب ہو گیا تو اُس نے اُدھار کے معاملے میں ایک عجیب ایجاد نکالی۔ ایک بار حاجی عبداللہ اپنے باڑے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا، جیرا آرام سے جا کر عبداللہ کے دائیں طرف بیٹھ گیا، حقے کے دو تین کش لگائے اور بولا، میاں کیا بتاؤں وہ گائے تو خدا جانتا ہے صالح کی اونٹنی کی نسل سے ہے۔ اللہ قسم ایسے بڈ کاٹھ کی گائے تو نیلی کے پانیوں میں نہیں دیکھی۔ یہ اتنا، دونوں بازوؤں کو پھیلاتے ہوئے، چوڑے کے برابر تو بھاگ بھری کا حوانہ ہے اور قد تو میاں ایسا ہے کہ دو آدمی اُوپر نیچے کھڑے کرلو، تب بھی اُونچی لگے، بس طور کی پہاڑی ہے۔ گلابی رنگت ناریوں کے رخساروں کو پچھاڑتی ہے۔ مَیں تو جانوں، یہودیوں کو اِسی گائے کے ذبح کا حکم تھا۔ بس بھائی عبداللہ! آپ کے یہ سب جانور ایک طرف اور وہ گائے ایک طرف۔

بھئی جیرے وہ گائے چل کے ابھی دیکھنا چاہئے۔ حاجی عبداللہ نے بے قراری سے پہلو بدلتے ہوئے کہا، ایسی گائے تو میرے باڑے میں ہونی چاہئے۔

نہ حاجی صاحب، جیرے نے بے نیازی سے کہا، اُسے خریدنے کا خیال دل سے نکال دیں۔ گلزار محمد جان دے دے گا مگر گائے کا بال کھینچ کر نہ دے گا۔ میرے سامنے منظور ووآ یہ نے دس ایکڑ زمین کے کاغذ سامنے رکھ دیے، کہا یہ رکھو اور گائے دے دو۔ گلزار نے مڑ کر نہیں دیکھا اور اُٹھ کر گائے کی تھوتھنی چومنے لگا۔

دودھ کی کیفیت کیا ہے؟ حاجی نے رشک سے پوچھا۔

واہ! یہ بھی اچھی ہی پوچھی آپ نے، جیرا بولا۔ مَیں وہاں پورے دس دن رہا اور انہی آنکھوں نے دیکھا کہ تین تین آدمی اُسے دن میں تین دفعہ دوہتے ہیں۔ بھئی واللہ ایک چھٹانک اُوپر نیچے بتاؤں تو دوزخ میں جاؤں۔ پورا پچاس لیٹر ایک دن میں دیتی ہے۔ بس بھائی ایسے ہی ہے جیسے کنویں سے مشکیں بھر بھر نکالتے جاؤ۔ میاں سارا محلہ اُسی کے دودھ سے پلتا ہے۔ صبح کی

چائے، دوپہر کی لسی اور شام کا فلو دو گلزار کی گائے کے سر ہے۔ اگر ایک دن دودھ نہ دے تو سمجھو محلے بھر میں سب کا روزہ ہو جائے۔

حاجی انتہائی بے چینی کے عالم میں گھورتے ہوئے بولا، جیرے میں تو تب مانوں گا جب آنکھوں سے دکھاؤ گے۔

ٹھیک ہے کل تیار ہو جاؤ۔ سویرے تاروں کی اوٹ میں نکل چلیں گے اور بارہ کا پہر "چک مراد کے" میں جا کر گلزار کے ڈیرے پر کریں گے۔ یہ کہہ کر جیرا اُٹھ کھڑا ہوا پھر رُک کر کہا، مگر؟

مگر کیا؟ حاجی نے اضطرار سے پوچھا۔

مَیں نے تو کل شہر جا کر برکت آڑھتی سے تین سو روپیہ لینا ہے اور نیک دین کو دینا ہے ورنہ وہ میری جان کو آ لے گا۔

پرسوں لے کر دے دینا، کون سی قیامت آ گئی ہے، حاجی نے کہا۔

نہ بھائی نہ! نیکا تو دھوتی اُتارنے پر تیار ہے۔ مَیں تو اُس بجو کے منہ پر کل ہی پیسے ماروں گا، جیرا نے کہا۔

حاجی عبداللہ نے دیکھا کہ شکار ہاتھ سے نکلتا ہے، اگر یہ کل گائے دکھانے نہ لے گیا تو کبھی نہ جائے گا۔ فوراً جیب سے تین سو روپے نکال کر جیرے کی جیب میں ٹھونس دیے اور کہا، پرسوں برکت سے لے کر مجھے دے دینا۔

ٹھیک ہے میاں عبداللہ اگر تمہاری ضد ہے تو یونہی سہی، جیرے نے ایک قسم کی بیزاری سی ظاہر کی، لیکن دیکھ! کل سویرے کا سورج ہم کلاس کی پل پر دیکھیں اور بگھی میں دو گھوڑے بہت ہوں گے۔ یہ کہہ کر جیرا سیدھا رفیق تیلی کے ہاں پہنچا اور دو سو اُس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا، جا بھائی سسر کا جنازہ بھگتا اور جان لے، یہ اِسی مہینے واپس کرنے ہیں مگر سب کو پتا تھا کہ کون سا اُدھار اور کہاں کی واپسی؟ دوسرے دن جیرے کو صبح سے پہلے ہی قصبے سے نکلنا پڑا مگر حاجی عبداللہ کے ساتھ دو گھوڑوں کی بگھی پر نہیں بلکہ اپنے گدھے پر کیونکہ ایسی گائے تو جیرے نے خواب میں بھی نہ دیکھی تھی، حاجی عبداللہ کو کہاں سے دکھاتا۔

صرف شرفا ہی اُس کی باتوں سے نہیں پٹتے تھے بلکہ کبوتر باز، کتے لڑانے والے،

رنڈی باز اور لُچوں لفنگوں تک اُس کے ہاتھوں مُکتے جا چکے تھے۔ وجہ صاف تھی، جیرے اور اُس کے گدھے نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ اور اب پیر مودے شاہ، جو خود پورے قصبے کا پیر تھا اور ایسی کرامات والا کہ دلوں پہ لکھا پڑھ لیتا، لوگ ہزاروں کی پونجی خوشی خوشی اُس کی جھولی میں اُلٹ دیتے، وہ جیرے کے دل کی تختی نہ پڑھ سکا اور پٹ گیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ صادق ماچھی کی بکری رات چوری ہوگئی۔ کم سے کم بھی کہوں تو پانچ سو سے کم نہ ہوگی۔ کھوجی بلوایا تو اُس نے شادے تیلی کا نام لیا۔ حالانکہ ہر کوئی جانتا تھا، آج چودھری اللہ یار نے پیر مودے شاہ کی دعوت کی ہے مگر بڑوں کے جوتے بڑے، نام کون لے؟ اُس پر ستم یہ ہوا کہ سو روپے اُلٹے کھوجی نے مانگ لیے۔ صادق ماچھی شام تک کا وعدہ کر کے جیرے کے پاس چلا آیا۔ یوں اس واقعے کی گانٹھ پڑی اور جیرے نے قصہ جانی چور سنا کر پیر صاحب کی گھوڑی ہتھیا لی۔ جیرا مودے شاہ کی بڑھکوں سے واقف تھا، اپنا گدھا صادق ماچھی کو دے کر اُسی وقت قصبے سے نکل گیا اور وہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

☆

دریائے بیاس پچھلے دو سال سے محض ایک ندی کے برابر رہ گیا تھا۔ خدا ہی جانتا تھا سب پانی کدھر گیا۔ اکثر بار اطلاع آئی کہ ہندوستان نے پانی روک لیا لیکن بزرگوں نے اس کی سختی سے تردید کردی کہ کبھی دریا پر بھی بند باندھے جا سکتے ہیں۔ یہ ضرور خدا کا قہر ہے۔ قربانیاں دینے میں بخل سے کام لیا گیا اسی سبب سے دریا ناراض ہوگیا اور اُس نے اپنا پانی بند کرلیا۔ قصبے کے مضافات میں جو تباہی آرہی تھی وہ آنکھوں سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ پانی کی قلت سے ہر شے مرجھا چکی تھی۔ فصلیں چوتھائی بھی نہ رہ گئیں۔ اکثر میدانوں میں خاک اُڑنے لگی۔ مال مویشی الگ پریشان اور بدحال تھے۔ بارشوں پر دارومدار بڑھ گیا، جو سال سال نہ ہوتیں۔ برگد اور پیپل کے پیڑ تو کسی طرح محفوظ تھے لیکن شیشم شرینہ اور پاپلر اِس طرح سوکھنے لگے جیسے کوئی آگ لگاتا چلا گیا ہو۔ اگلے دو سال میں بگولوں نے پورے علاقے میں ناچ شروع کردیا۔ ہواؤں میں جو خنکی تھی وہ جاتی رہی اور خشکی لو دینے لگی۔ اس سب کچھ کی بنا پر لوگوں کی معیشت کو ایک بڑا دھچکا لگا، جن کا انحصار ہی زراعت پر تھا اور زراعت دریا کے سبب تھی۔ پہلے پہل تو لوگ عبادت پر مائل ہوئے اور دعائیں مانگتے رہے لیکن مسئلہ حل نہ ہوا تو عبادت چھوڑ دی، مسجدوں میں وہی رہ گئے جو

پرانے نمازی تھے۔ لوگوں کی طبیعتوں میں چڑ چڑا پن آتا گیا۔ موسم میں اعتدال کے بجائے شدت پیدا ہو گئی یعنی سخت گرمی اور سخت سردی۔ جب دو سال سے بارش کا ایک قطرہ نہ ہوا تو ندی کا بقیہ پانی بھی سوکھ گیا۔ حکومت نے جو نہریں دوسرے دریاؤں سے نکالی تھیں وہ نہایت ناکافی تھیں۔ ان کو کھلے پانیوں کی عادت تھی، اس چلو بھر پانی پر کیا اکتفا کرتے۔ باغات تو بالکل بھسم ہو کر رہ گئے۔ پانچ سال کے اندر قصبہ کے مضافات ویران ہو گئے اور قصبے والے کمال پریشانی میں مبتلا ہوئے۔ جیرا بھی اب زیادہ عرصہ قصبے سے باہر ہی رہتا کیونکہ قصبے کی حالت اُس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ دوسری وجہ قصبے کی غربت تھی جس کے باعث جیرے کی خاطر میں بھی کافی کمی ہو گئی۔ علاوہ ان باتوں کے، اب گھوڑی ہاتھ لگ گئی تھی اس لیے دور دور نکلنے لگا۔ لیکن سال میں دو چار پھیرے ضرور لگا لیتا۔ پچھلے مہینے جیرا پورے سال بعد قصبے میں داخل ہوا اور یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا کہ لوگوں کے مزاج میں کچھ زیادہ ہی چڑ چڑا پن آ گیا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر اُس کے دل کو ایک ٹھیس سی لگی۔ اُس نے سوچا کہ وہ پرسوں ہی قصبے سے چلا جائے گا اور پھر کبھی نہ آئے گا۔

دوسرے دن اتفاق سے پیر مودے شاہ بھی قصبے میں آ گیا۔ لوگوں کو اُس کی آمد کا پتہ چلا تو حاضری کے لئے دوڑے اور پریشان حال عوام التجائیں لے لے کر حضور میں پہنچے۔

شہاب دین گڑ گڑایا، سرکار لُٹ گئے، کھیت اُجڑ گئے۔ حضور فصلوں میں جھاڑو پھر گئی۔

حضور بابا جی! باغات کو لُو کھا گئی۔ اب تو بھوکوں مرتے ہیں۔ واسطہ شاہ دے سرکار کا کوئی معجزہ کرو، جمال رو رو کر التجائیں کرنے لگا۔

شیر علی نے پگڑی مودے شاہ کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا، حضرت دریا روٹھ گیا۔ ہم سے بھول ہو گئی۔ جب سے ہم نے اُسے قربانیاں دینی بند کر دیں، اُس نے ہمارا رزق بند کر دیا۔ ساری زمینیں راجستھان ہو گئیں۔

نذیر بانسری والا بولا، بابا جی کوئی ایسی کرامات کرو کہ دریا ٹھاٹھیں مارتا نکل آئے۔ پھر سے ہر طرف ایسا ہرا ہو کہ آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔

پیر مودے شاہ کچھ دیر سب تحمل سے سنتا رہا، آخر گرجدار آواز سے بولا، اللہ کے کاموں میں دخل دینے سے یہی کچھ ہوتا ہے۔ تم نے بڑے بڑے پُل بنا دیے اور دریا کو قربانیاں نہ دیں پھر وہ کیوں تمہیں رزق دے۔ اب بھگتو اپنے کئے کی سزا۔

ناں بابا جی ناں، آپ تو ہمارے رکھوالو ہیں۔ آپ کی خدا بھی نہ موڑے گا۔ حضور کچھ نہ کچھ ضرور کریں۔ ہم یہ پل شُل ابھی ڈھا کر زمین کے برابر کر دیں گے، جو ہمارے سینوں پر اب سانپ کی طرح کھڑا ہے، شریف محمد زار زار رونے لگا۔

بابا جی ہم عہد کرتے ہیں۔ آپ جو کہیں گے وہی کریں گے۔ بال برابر ادھر نہ اُدھر۔ چاہے خراس میں پسوا دو مگر دریا بہنا چاہیے، کمال احمد بھی تقریباً رو پڑا۔

اسی طرح آہ و زاری کرتے جب آدھی رات نکل گئی تو آخر پیر مودے شاہ نے کہا، ٹھیک ہے ہم آج تمہارے لئے کچھ کرتے ہیں۔ تم اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ، ہم چلہ کھینچتے ہیں۔ جو حکم ملا، صبح کو بتا دیں گے اور خبردار اگر اُس حکم کے بجا لانے میں ذرا بھی سرتابی کی تو پھر تمہیں مکمل تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ ہر صورت وہی کرنا ہوگا جو ہم کہیں گے، اللہ اکبر۔

مودے شاہ کا حکم پا کر تمام لوگ گھروں کو چل دیے۔ بابا جی کمرے میں تبجارہ گئے اور اندر سے کنڈی چڑھا کر چلّے میں مصروف ہو گئے۔

ادھر قصبے والوں کی آنکھوں سے نیند بالکل اُڑ گئی۔ وہ بے چینی سے صبح کا انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں بابا جی کو کیا حکم ملتا ہے؟ جس کے بجا لانے کے لئے وہ اپنے آپ کو تیار کر چکے تھے۔ صبح ہوئی تو بابا جی نے دروازہ کھولا۔ لوگوں کا بڑا مجمع مٹھ لگا کر کھڑا تھا۔ مودے شاہ نے اُن میں سے چار سرکردہ افراد کو چن لیا اور اُنہیں دوبارہ کمرے میں لے گیا، باقی لوگوں کو اپنے اپنے گھروں کو جانے کا حکم ہو گیا۔ جب اضافی لوگ گھروں کو جا چکے تو مودے شاہ نے اُن کو اللہ کا حکم سُنا دیا اور کہا، دریا ایک قربانی مانگتا ہے اور وہ قربانی جانے مانے قصہ گو کی ہو، اُسی کا خون دریا میں روانی لائے گا۔ یہ حکم سُن کر سب پر خاموشی چھا گئی مگر امرِ الٰہی پر کس کا اختیار تھا، چنانچہ سب نے عمل کرنے کا عہد کیا اور مودے شاہ کے کمرے سے نکل آئے۔

رات دس بجے کے قریب چار آدمی جیرے کی کوٹھڑی میں داخل ہو گئے۔ جیرا بہت رویا پیٹا مگر اب خدا کے کاموں میں دخل دینے کی قصبے والوں میں ہمت نہیں تھی۔ جیرے کو مضبوطی کے ساتھ رسیوں میں جکڑا اور دریا پر لے جا کر خشک ریت پر لٹا دیا۔ ایک آدمی نے تیز چھری اُس کے گلے پر رکھ دی۔ پھر چند لمحوں میں گلے سے نکلتے ہوئے گرم خون کو دریا کی پیاسی ریت پی گئی اور اگلی صبح پیر صاحب سحر پھوٹنے سے پہلے قصبہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔

شاہ محمد کا ٹانگہ

مَیں دیر تک بوسیدہ دیوار سے لگا، تانگے کے ڈھانچے کو دیکھتا رہا، جس کا ایک حصہ زمین میں دھنس چکا تھا اور دوسرا سوکھے پیڑ کے ساتھ سہارا لیے کھڑا تھا، جس کی ٹنڈ منڈ شاخوں پر بیٹھا کوا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ کچھ راہ گیر سلام دعا کے لیے رُکے لیکن میری توجہ نہ پا کر آگے بڑھ گئے۔ مجھے اُس لکڑی کے پہیے اور ہیولے کے ڈھانچے نے کھینچ کر تیس سال پیچھے لے جا پھینکا۔

لے بھئی جوان! شاہ محمد نے چھانٹے کی لکڑی تانگے کے پہیے سے ٹکراتے ہوئے بات شروع کی، اُن دنوں مَیں ممبئی میں تھا اور جوانی مجھ پر پھوٹی پڑتی تھی اور خون تازہ تھا۔ بس وہ کار جاپان سے بن کر نئی نئی ہندوستان پہنچی کہ مَیں نے خرید لی (اس بات کے دوران اُس نے چھانٹا پھر گھومتے ہوئے پہیے کے ساتھ لگا دیا، جس کی رگڑ سے گزررر گزررر کی آواز پیدا ہوئی اور گھوڑا مزید تیز ہو گیا) اور لگا ممبئی کی سڑکوں پر دوڑانے۔ میاں جوانی اندھا خون ہوتا ہے، نیلے گڑھے نہیں دیکھتا، رگوں میں شراب کی طرح دوڑتا ہے اور میری کوئی جوانی تھی؟ شہابی رنگ تھا اور کناری سی مونچھیں، پھر گاڑی کا ہاتھ آ جانا قیامت ہو گیا، سوار ہو کر سڑک پر آتا تو لوگ کناروں سے جا لگتے، کہتے بھائی! او میں لے لو، شاہ محمد قضا پر سوار چلا آتا ہے۔ اُن دنوں کار پر سواری بٹھانا شرم کی بات تھی اس لیے اکیلا ہی گھومتا۔ ممبئی کے ہجوم کا تو آپ کو پتا ہی ہے، لیکن مَیں نے کہا، شاہ محمد بات جب ہے، جب تُو گاڑی بھری سڑک پر ہوا کی طرح چلائے۔ پھر تھوڑے ہی دنوں میں سرکس والوں کو پچھاڑنے لگا۔

تو کیا آپ سرکس میں کام کرنے لگے تھے؟ مَیں نے حیران ہو کر سوال کیا۔

او میرے بھتیجے! شاہ محمد نے گھوڑے کو چھانٹا مار کر مزید تیز کر دیا، سرکس والی بات تو میں

مثال دینے کے لیے کر رہا ہوں۔ میرا اُن مداریوں سے کیا تعلق؟ وہ بچارے تو پیٹ بھرنے کے لیے یہ دھندا کرتے ہیں، روزی روٹی کی تھوڑ اُن کو موت کے رسوں پر چلاتی ہے۔ اِدھر تجھے تو پتا نہیں، پر اللہ بخشے تیرا دادا میرے باپ کو جانتا تھا۔ ہم پُرکھوں سے نواب تھے۔ لاکھوں ہی روپے ان ہاتھوں سے کھیل تماشوں میں جھونک دیے۔ خیر چھوڑ ان باتوں کو، بات جاپانی کار کی ہو رہی تھی۔ ممبئی کی سڑکوں پر دوڑاتے دوڑاتے پورا سپرٹ ہو گیا اور حد یہ ہوئی کہ چلتے ہوئے بڑے ٹرالروں کے نیچے سے گزارنے لگا۔ یوں ایک چھپاکے سے چلتے ٹرالر کے درمیان سے نکل جاتا، جیسے بھوت اُڑ جائے۔ ممبئی میں میری مثالیں بن گئیں۔

اب میرے کان کھڑے ہوئے۔ مَیں نے شدید حیرانی سے پوچھا، وہ کیسے چاچا شاہ محمد؟

ہاہا، شاہ محمد نے مونچھ پر ہاتھ پھیر کر گھوڑے کو برابر تھپکی دی اور بولا، جوان یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آسکتی، بس تُو چپ کر کے سنتا جا۔ ایک دن عجیب قصہ ہُوا، مَیں کار میں جا رہا تھا، قدرت خدا کی دیکھو، وہ واحد دن تھا جب میری رفتار ہلکی تھی۔ کیا دیکھتا ہوں، سڑک کنارے ایک آدمی نڈھال اور بُرے حال میں زخمی بھاگا جا رہا ہے۔ محسوس ہوتا تھا، ابھی گرا۔ اُس کے پیچھے پولیس ہُوٹر مارتی چڑھی آ رہی تھی۔ مَیں نے سوچا، بچارا مارا جائے گا، کچھ خدا ترسی کر دے۔ اُسی لیے مَیں نے کار اُس کے پاس لے جا کر کھڑی کی اور کہا بھئی جلد بیٹھ جا۔ لو جی، اِدھر وہ گاڑی میں بیٹھا، اُدھر مَیں نے ریس دبا دی۔ اب پیچھے پولیس اور اُس کی ہوٹریں اور آگے مَیں۔ وہ بندہ بہت گھبرایا کہ ابھی پکڑے جائیں گے۔ اب اُس بجڑ بھوسے کو کون بتائے کہ وہ کس کے ساتھ بیٹھا ہے؟ مَیں تو جانتا تھا، بچاری ممبئی پولیس کی کیا اوقات ہے، سو سال ٹریننگیں لے پھر بھی میری ہوا کو نہ پہنچے۔ ٹکے ٹکے کے سپاہی روٹی روزی کی مصیبتوں میں پھنسے، چور تھوڑی پکڑتے ہیں؟ بچاروں نے رزق کا پھندا لگایا ہوتا ہے، ہمارا کیا مقابلہ کریں گے۔ اب ممبئی کی سڑکیں تھیں، ہماری کار تھی اور پولیس کی دس گاڑیاں۔ مَیں نے چلتے ہوئے پوچھا، بھائی کیا الفڑا کر کے بھاگے ہو، کہ اتنے غنڈے پیچھے لگا لیے؟ تحمل سے بولا، سیٹھ بھیم داس کھتری کی تجوری لوٹی ہے، کھتری کے چاقو بھی لگ گیا ہے، اب بُرا پھنسا ہوں، پکڑا گیا تو سیدھا پھانسی گھاٹ فلائی ہو گی۔ میرے تو ہوش کی ایسی تیسی پھر گئی۔ او تیرے مُردوں کی خیر۔ بھیم داس کھتری کروڑوں کا مالک۔ پورے ممبئی میں اُسی کے سود کا سکہ چلتا تھا۔ اُس کی تجوری لوٹنے کا مطلب تھا راتوں رات سیٹھ بن جانا۔ مَیں نے

پوچھا، مگر تم تو خالی ہاتھ ہو؟ بولا، ابھی چندر اکھیم کے پُل نیچے پھینک آیا ہوں، بس ایک دفعہ ان لفنگوں سے جان چھڑادو، تمھیں مالا مال کردوں گا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا کہ یہ کون ہوتا ہے ہم نوابوں کو مالا مال کرنے والا؟ مگر اُس کی نا سمجھی دیکھ کر غصہ پی گیا، البتہ ریس پر پاؤں کا دباؤ مزید بڑھ گیا، جس کی وجہ سے کار اب چلتی نہ تھی گویا اُڑتی تھی۔

اتنے میں ایک بکریوں کا ریوڑ سڑک سے گزرنے لگا اور شاہ محمد کو گھوڑے کی لگام کھینچنا پڑی، اس کے ساتھ اُس کی داستان بھی رُک گئی، وہ بدمزگی سے بولا، یار یہ ایالی لوگ بھی خدا جانتا ہے، زلزلے کی گھڑی پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں سے گزرتے ہیں ہر چیز کا ناس پھیر دیتے ہیں۔ سڑکیں تو ان کے باپ کی ہوتی ہیں، جو اپنے نام لکھوا لیتے ہیں۔ دیکھ، کس سکون سے کاپا کاندھے پر رکھے اکڑتا جا رہا ہے، جیسے نادر شاہ کا سالا ہو۔ ایالی کو آواز دیتے ہوئے، او بھائی جلدی کر، گھوڑا بدکتا ہے، بھیڑوں کو جلدی ہانک لے، اُف خداوندا کیسا شیطانی آنت کا ریوڑ ہے؟ ایالی نے شاہ محمد کی آواز سُنی ہی نہیں، اُسی بُردباری سے سڑک کے درمیان چلتا رہا۔ شاہ محمد پر یہ دورانیہ صدیوں پہ محیط ہو گیا مگر انتظار کے سوا کیا کر سکتا تھا؟ قصہ سننے کی بے چینی مجھے بھی تھی لیکن میری طبیعت میں ذرا اطمینان تھا۔ خدا خدا کر کے تانگے کے گزرنے کا رستا بنا تو شاہ محمد نے شکر کا کلمہ پڑھا اور دوبارہ گھوڑے کو چابک دکھایا۔ گھوڑے نے چال پکڑی تو مَیں نے کہا، چاچا پھر آگے کیا ہوا؟

یار اس ایالی نے بات کا مزا ہی ہوا کر دیا۔ خیر، تو بھائی مَیں کہہ رہا تھا، مجھے اُس دمڑی گیر کی بات پر بہت غصہ آیا لیکن یہ سمجھ کر پی گیا کہ نا سمجھ ہے، جانے دو۔ گاڑی، پتا نہیں کتنے میل کی سپیڈ پر تھی، میٹر کی سوئی پر تو مَیں نے نظر نہ کی، البتہ پہیے کبھی زمین پر لگتے تھے، کبھی نہیں، عین اُسی لمحے ہمارے سامنے بھترانج کے پہیوں والے دو ٹرک آ گئے۔ ایک دائیں سے، ایک بائیں سے۔ اب کیا تھا، پیچھے پولیس، آگے دو ٹرک اور سڑک تنگ۔ مَیں نے کہا، لے بھئی شاہ محمد یہی وقت ہے عزت بچانے کا، اب پرائی مصیبت سر پر لی ہے تو اسے نکلت اور کھیل جا جان پر۔ لو جی، مَیں نے فوراً ہی فیصلہ کیا۔ اُسے کہا، کاکا مضبوط ہو جا اور پھرتی سے کار کو ایک ٹرک کے نیچے سے گزار کر سڑک کے دوسری طرف ہو گیا۔

ٹرک کے نیچے سے؟ چلتے ٹرک کے نیچے سے؟ اُف میرے اللہ، مجھ پر گویا حیرانی کا دورہ پڑ گیا۔ اگر کچلے جاتے تو پھر؟

ہاہاہاہا، زور کا قہقہہ۔ بیٹا! اسی کا نام تو ہشیاری اور کاری گری ہے، شاہ محمد نے سینہ فخر سے پھلاتے ہوئے کہا، ان کاموں میں پلک جھپکنے کا حساب رکھنا پڑتا ہے، لمحے بھر کی غلطی ہوئی نہیں کہ بندہ اللہ ہُو ہو جاتا ہے۔ بہر حال آگے سُن، دیکھا تو آگے سڑک ہی نہیں تھی، لمبی اور گہری کھائی تھی۔ بیلیا! یہاں بھی مری حاضر دماغی کام آئی، مَیں نے ایک منٹ کے ہزارویں حصے میں ہینڈل کو دوسری طرف گھما دیا۔ بس یہ سمجھ لو، اُس وقت میری پھرتی سلیمان پیغمبر کے وزیر سے بھی زیادہ تھی۔ میری اس تیزی سے یہ ہوا کہ گاڑی ایک طرف کے دو پہیوں پر ہوگئی۔ اب وہ کھائی سے تو بچ گئی لیکن سکوٹر کی طرح دو پہیوں پر ہی دوڑتی گئی، بھائی وہاں تو اچھا خاصا تماشا بن گیا۔ ممبئی کی خلقت بھاگ کر سڑک کے کنارے جمع ہوگئی۔ مَیں نے سوچا، ہماری تو جان پر بنی ہے اور انہیں دیکھنے کو کھیل مل گیا۔ اب گاڑی کی رفتار اتنی تھی کہ بچارے میٹر کی سوئی کے بس سے باہر ہوگئی، اگر اُسی وقت چار پہیوں پر کرتا تو اُلٹ جاتی۔ مَیں نے سوچا، اِسے اسی طرح جانے دو۔ وہ بھڑ والا ایک دفعہ بولا، بھائی اسے سیدھی کرلو ورنہ مر جائیں گے۔ مَیں نے فوراً ڈانٹ دیا، نالائق چپ رہ، جس کام کا پتہ نہیں، درمیان میں نہیں ٹوکتے۔ کار کو تین میل تک اسی طرح دو پہیوں پر رکھا اور بھوت کی طرح نکل گیا۔ جوان، کیا زمانے تھے اور ایک یہ دن ہیں، ایالی رستہ نہیں دیتے۔ شاہ محمد کی بات جاری تھی کہ گاؤں آگیا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا، لے بئی جوان باقی قصہ کل پر۔ مَیں چھلانگ مار کر تانگے سے نیچے اُتر گیا۔

....

یہ میرا مقامی شہر تھا۔ مَیں اسلامیہ ہائی سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی بھاگتا ہوا گیٹ سے باہر نکل آتا۔ یہاں سے پچاس قدم پر وینس چوک تھا، اُس سے گزر کر تانگوں والے اڈے پر آجاتا اور شاہ محمد کے تانگے کی اگلی سیٹ پر جم کر بیٹھ جاتا۔ بعض دفعہ سواریاں کم ہونے کی وجہ سے مجھے اڈے پر کافی دیر بیٹھنا پڑتا۔ تانگوں والا اڈا چار کنال رقبے پر محیط اور سارا کا سارا مسقف تھا۔ چھت لکڑی کے شہتیروں اور آنکڑوں پر سرکنڈوں کی پر تلیں بچھا کر تیار کی گئی تھی اور سر سے ذرا ہی اُونچی تھی۔ تانگے پر بیٹھا آدمی آسانی سے اُسے چھو لیتا۔ گرمیوں میں ستونوں کے ساتھ سُوتی بوریاں لٹکا کر اُن پر پانی چھڑک دیا جاتا کہ ہوا ٹھنڈی ہو کر گھوڑوں کو لگے۔ اس کیفیت میں یہ ایک نہایت خاموش اور پُرسکون سرا معلوم ہوتی، جس میں کبھی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آجاتی یا

چڑیوں کے پھڑ پھڑانے کی سرسراہٹ، جب وہ گھونسلے سے نکل کر دوسرے شہتیر پر بیٹھتیں۔ وہاں تین چار ہوٹلیں بھی تھیں۔ ہوٹل مالکان نے وی سی آر رکھے ہوئے تھے، جن پر انڈین اردو اور پاکستانی پنجابی فلمیں چلتیں۔ کوچوان فرصت کے وقت یہیں پر تیز چی کی چائے پیتے اور ایک روپے کے ٹکٹ کے عوض فلمیں دیکھتے۔ یوں تو صفائی کا خیال رکھا جاتا لیکن لید کی ہلکی بو اس طرح اُن میں بسی تھی کہ عام آدمی کے فوراً ناک کو چڑھ جاتی مگر کوچوانوں، ہوٹل والوں اور پڑوس کے رہائشیوں کے لیے اسی لید کی بُو میں ذہنی آسودگی تھی۔ ہوٹلیں نیم اندھیرے میں ڈوبی ہوئی، نہایت تنگ، نیچی چھتوں والی تھیں۔ فرش اڈے کی زمینی سطح سے دو دو فٹ نیچے اُتر چکے تھے۔ اُن کی دیواروں اور چھتوں پر دھویں کا گاڑھا پلستر اس طرح چڑھا تھا کہ اب وہاں جیسی بھی تیز روشنی کی جاتی، وہ اندھی اندھی محسوس ہوتی۔ مٹی کے تیل سے جلنے والے چولہوں کا دھواں ہر نئے دن اُس اندھیرے اور کالک میں اضافہ کر رہا تھا۔ دیواروں پر ہیما مالنی، نور جہاں، دلیپ کمار اور جانے کن کن اداکاروں کی تصویریں تھیں، جن کے اُوپر ذرا بلندی پر قرآنی آیتیں، عبدالقادر جیلانی اور دیگر ولیوں کے پوسٹر بھی آویزاں تھے۔ ان سب کو دھویں نے بغیر کسی تمیز کے کالا کر دیا تھا۔ ہوٹل کا مالک اُنہیں لگا کر بھول چکا تھا اور یہ بھی نہیں سوچا کہ کم از کم مسلمان پوسٹروں سے دھویں کی تہیں ہٹا دے۔ سب کوچوان مضافاتی گاؤں سے سواریاں لا کر شہر میں چھوڑ دیتے اور تانگہ بھرنے تک یہیں رہتے۔ اڈے میں بیس پچیس تانگے ہر وقت کھڑے رہتے اور گھوڑے تھان سے بندھے ہرا لوسرن یا دانہ کھانے میں مگن۔ کچھ سائیں لوگ گھوڑے سر نیچا کیے مراقبے میں رہتے حتیٰ کہ کوچوان اُنہیں دوبارہ تانگے میں جوت دیتے۔ تھان کے ساتھ بیس فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا پانی کا حوض بھی تھا۔ جس طرح کوچوان آپس میں واقف تھے، اسی طرح گھوڑے بھی ایک دوسرے سے جان پہچان رکھتے تھے۔ جب ایک گھوڑا سواریاں لے کر رخصت ہوتا تو ساتھ والا کنوتیاں اُٹھا کر مدھم سا ہنہناتا، جیسے الوداع کہہ رہا ہو۔ شاہ محمد ہمارے گاؤں کا تھا۔ میرا اُس سے تعارف تب ہوا جب چھٹی جماعت کے لیے مجھے مقامی شہر کے اسکول میں داخل کرایا گیا اور اُسی کے تانگے پر میرا آنا جانا ٹھہر گیا۔ سکول جاتے اور وہاں سے شاہ محمد کے ساتھ واپس آتے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ اس دوران اُس نے اپنی زندگی کے کئی ایسے واقعات سنائے جو حیران کن تھے۔ ہر واقعہ کسی بڑے شہر میں اُس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ کب ان شہروں میں پھرتا رہا؟ اس بات سے سب ناواقف تھے۔

پچھلے پندرہ سال سے تو وہ اسی اڈے پر تانگہ چلا رہا تھا۔ البتہ واقعات ایسی ولآ ویزی سے سناتا کہ اُس کی بات پر یقین کرتے ہی بنتی۔ شاہ محمد بھبو کے ساتھ لگی اُس تختی پر بیٹھتا جو ہر تانگے میں اسی مقصد کے لیے لگائی جاتی ہے۔ سیٹ پر اُسے کبھی کبھار ہی بیٹھنا نصیب ہوتا لیکن مجھے اُس وقت شدید غصہ آتا جب سواریوں کے زیادہ ہو جانے کی وجہ سے وہ مجھے بچہ سمجھ کر ہودے میں بٹھا دیتا مگر چند ہی لمحوں میں، جب وہ کہانی شروع کرتا تو مجھے بے عزتی کا احساس نہ رہتا۔ یہ میرا شہر میں پہلا سال تھا، جو دوسرے سال کے آخر تک اسی دلفریب یکسانیت سے چلا۔ اس عرصے میں مَیں نے سکول سے بہت کم ناغے کیے۔ ایسا نہیں کہ پڑھائی کا بہت شوق تھا، بلکہ شاہ محمد کی زبان سے قصہ سننے کا ایسا لپکا پڑا کہ مَیں اگلی صبح کا بے چینی سے انتظار کرتا اور گھر والے سمجھتے مَیں پڑھاکو ہو چکا ہوں۔ یہ قصے کتابی نہیں تھے بلکہ ایسی ہڈ بیتیاں تھیں، جو مختلف شہروں اور ملکوں ملکوں کی سیر کے دوران اُسی پر گزری تھیں۔ موقعے کا نقشہ ایسے کھینچتا کہ میری آنکھیں وہ منظر گویا سامنے دیکھ لیتیں۔ یوں اپنے بچپن ہی میں شہر شہر سے واقف ہو گیا اور شاہ محمد پر رشک کرتا جو ایسے ایسے کرتب کر کے آج یہاں تانگہ چلا رہا تھا۔

تیسرے سال میرے پَر نکل گئے اور مَیں نے گھر میں سیاپا ڈال کے ایک سائیکل خرید لی، پھر میٹرک تک اُسی سائیکل پر رہا، جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ سارے شہر کی گلیاں ناپتا۔ خاص کر بہار کے دنوں میں سائیکل پر سوار ہو کر سڑک کے کنارے، درختوں کے سائے سائے پھرنا مجھے جنت کی سیر کے برابر لگتا۔ کمپنی باغ، پہلوانوں کا باغ، اسٹیڈیم اور دو آبہ نہر سے لے کر ہیرا منڈی کی سیر تک، سب کا کریڈٹ میری سائیکل کو جاتا ہے۔ اب میرا رُخ کبھی کبھار ہی تانگوں کے اڈے کی طرف ہوتا۔ ایک دفعہ گھر والوں نے کہا، چارپائیوں کا بان لیتے آنا چنانچہ بان خریدنے کے لیے مجھے اسی طرف آنا پڑا، ایک بار اپنے دادا کی حقے کی چلم بھی یہیں سے خریدی۔ اگلے سال یعنی میٹرک پاس کرتے ہی مَیں نے گاؤں کو خیرباد کہہ دیا اور شہر میں دوستوں کے ساتھ رہنے لگا۔ اس صورت میں تانگے کے ساتھ وہ تعلق بھی ختم ہو گیا، جو گاؤں سے شہر آتے جاتے سائیکل کی دوڑ تانگے سے باندھ لیتا تھا۔ اگلے دو سال میں ایک دو دفعہ ہی شاہ محمد سے آمنا سامنا ہوا۔ نئے دوستوں کی محفلوں میں یہ سال اتنی تیزی سے نکل گئے کہ مجھے خبر ہی نہ ہوئی حتیٰ کہ مَیں نے ایف اے کر لیا اور گریجوایشن کے لیے لاہور چلا آیا۔ اب دو دو مہینے بعد گھر جاتا۔ اس سفر میں

شاہ محمد کے تانگے کو کوئی دخل نہیں تھا کیونکہ گاؤں رابطہ سڑک سے تین میل ہٹ کے تھا اور اس رابطہ سڑک پر بہت زیادہ بسیں چلنا شروع ہو گئیں، جو پہلے دو تین ہی چلتی تھیں۔ یہاں بھی گاؤں کے کچھ تانگے کھڑے ہوتے، جو بس سے اُترنے والی سواریوں کو گاؤں لے جاتے۔ مَیں بھی انہی تانگوں کے ذریعے گاؤں جانے لگا۔ شاہ محمد اس عرصے میرے منظر سے دور رہا اور دو سال مزید گزر گئے۔ اگلی دفعہ گاؤں گیا تو بہار کے دن تھے۔ درختوں کی شاخوں پر ہری ہری کونپلیں تازگی بھر رہی تھیں۔ اس بار دل میں خواہش جاگی، کیوں نہ آج شاہ محمد کے ساتھ سفر کیا جائے۔ مَیں اپنے مقامی شہر سے گاؤں جانے کے لیے سیدھا تانگوں کے اڈے کی طرف چلا گیا لیکن اڈے میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ وہاں چار چھ تانگوں کے علاوہ باقی سب رکشے تھے اور شور اتنا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پھٹے سائیلنسروں اور گڑگڑاتے انجنوں کے سبب اڈے کی چھت اُڑی جاتی تھی۔ اس بدہنگم مخلوق کے درمیان گھوڑے سہمے ہوئے تھے۔ ہر چیز جلدی سے بدل رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر دل بیٹھ سا گیا۔ مَیں کچھ دیر بدحواس کھڑا رہا پھر ہمت کر کے آگے بڑھا، مجھے یقین تھا، شاہ محمد ابھی یہاں ہوگا۔ مَیں اڈے کا جائزہ لینے لگا اور چند ثانیوں بعد ہی اُس کے تانگے پر نظر جا ٹھہری، جس کی ایک ایک پتری مجھے یاد تھی۔ اُس کی حالت کافی خراب ہو چکی تھی، پھر بھی پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی البتہ گھوڑا وہ نہیں تھا۔ تانگے کو دیکھ کر ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ میں سیدھا اُس ہوٹل کی طرف بڑھا جہاں میرے خیال میں اُسے ہونا چاہیے تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی شاہ محمد کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ اُٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا، جیسے مدتوں کا بچھڑا ہوا ساتھی ہو۔

بھتیجے دور ہی نکل گئے ہو، کیا تم نے سمجھ لیا تھا، شاہ محمد مر گیا؟ مان لیا شہری بابو بن گئے ہو پر بندہ حال چال ہی پوچھنے کو آ جائے، آدمی کو اپنے زندہ ہونے کا احساس رہتا ہے۔ ہم بھی بڑے بڑے شہروں میں رہے ہیں پر تُو تو پھر منہ دکھانے سے بھی گیا۔ کئی بار سنا کہ تُو گاؤں آیا اور بغیر ملے چلا گیا۔ مَیں سوچتا تھا بھتیجا ایسا تو نہیں پھر نہ جانے کیا بات ہے؟

شاہ محمد بول رہا تھا اور میں شرمندگی سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ مَیں نے جان چھڑانے کے لیے کہا، چاچا باقی شکوے بعد میں کہہ لینا پہلے باہر نکل کے گھوڑے کے ساز کس، تاکہ گاؤں چلیں۔

چائے تو پی لے، شاہ محمد نے چائے والے کو للکارا، بھائی ایک کڑک دودھ پتی بنا دے، آج بڑی مدت بعد بھتیجا اڈے پر آیا ہے۔

نہیں، مَیں نہیں پیتا۔مَیں نے منع کرتے ہوئے کہا۔

او بیٹھ جا پتر، شاہ محمد نے اس ملگجی روشنی میں مجھے زبردستی لکڑی کے بنچ پر بٹھاتے ہوئے ہوٹل والے کو دوبارہ للکارا۔

ہوٹل کی حالت دیکھ کر مجھے ڈر ہوا، کہیں اِسے بھی گرا کر برابر نہ کر دیا جائے، اور سب چھوٹی ہوٹلوں کی جگہ ایک بڑا کنکریٹ کا پلازہ نہ کھڑا ہو جائے، جس میں چائے کی جگہ کولڈ ڈرنک اور برگر بکنے لگیں، اور ان کچی پکی دھواں زدہ اساطیری دیواروں پر مذہبی اور فلمی پوسٹروں کی جگہ پینا فلیکس نہ لے لیں۔ یہ خیال آتے ہی سر چکرانے لگا مگر جلد ہی چائے کی نئی پیالی دیکھ کر اُس میں سے چسکی لی اور سب خیالوں کو ایک دم جھٹک دیا۔

اڈے سے باہر نکلتے ہی شاہ محمد نے دوبارہ شکائتیں شروع کر دیں جنھیں مَیں کچھ دیر سنتا رہا آخر بولا، چاچا، دنیا کے دھندوں میں وقت کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ بہت دفعہ آپ کی طرف آنے کا ارادہ باندھا مگر وقت نہیں ملا۔ آج سوچا، کچھ بھی ہو جائے، چاچے شاہ محمد کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ بہر حال تانگے کی بتا، کیسا چل رہا ہے؟ مَیں تو اڈے کی حالت دیکھ کر پریشان سا ہو گیا ہوں۔

بیٹے کیا پوچھتے ہو اڈے کا؟ شاہ محمد کا لہجہ اچانک افسردہ ہو گیا، خدا غارت کرے ان پھٹ پھٹیوں کو۔ اڈا تو ایک طرف، انھوں نے پورے شہر کا ناس مار دیا۔ اللہ جانے کس شیطان نے پہلے پہل سکوٹر کے پیچھے لوہے کا پیپا باندھ کر اس چڑیل کو بنایا تھا۔ اب جدھر دیکھو، یہی شیطانی ڈبے دڑ دڑاتا پھرتا ہے۔ اس کی وجہ سے قسم لے لو، میرے کان اب بالکل بہرے ہو گئے، کچھ سنائی نہیں دیتا۔ تیل اور دھویں کی بدبو ایک طرف، کلیجے پر بھی کالک کی تہیں چڑھ گئیں۔ ان کی وجہ سے پورے شہر پر، وہ جو کالی دیوی کے بارے میں سنتے تھے، اُس کا سایا پھر گیا ہے۔ صفائی اور سکون تو غارت ہوا سو ہوا، جان کا خطرہ الگ سے ہے۔

جان کا اِس میں کیا خطرہ ہے؟ مَیں نے شاہ محمد کو مزید بلایا۔

لو بھئی تم جیسے انجانے ہو، شاہ محمد نے اب کے مزے لیتے ہوئے بات شروع کی، روز ان کے ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ بندہ اچھا بھلا گھر سے نکلا لیکن ملا ہسپتال سے۔ سبب پوچھو تو سکوٹر رکشے کا نام لے کر چپ ہو جاتا ہے۔ ابھی جا کے دیکھو، بڑے ہسپتال میں آدھے اسی بلا کے مارے پڑے ہیں۔ حکومت کی پٹیاں کم پڑ گئیں اور ہڈی جوڑ ڈاکٹروں کی چاندی ہو گئی۔

اتنے ایکسیڈنٹ کیسے ہوتے ہیں؟ میں نے شاہ محمد کی بات کو ہنسی میں اُڑانا چاہا۔

شاہ محمد اب پورے تضحیک آمیز لہجے میں بولا، وجہ اس کی یہ ہے کہ جس کو ڈھنگ سے سائیکل نہیں چلانی آتی، اُسی نے یہ بیماری خریدی اور لگا سواریوں کی قسمت جلانے۔ کسی کا ٹائر کھل گیا، کسی کا زنجیر ٹوٹا اور پڑا سڑک کے بیچ بکھر کے۔ بھئی بعض دفعہ تو اللہ معاف کرے، دیکھ کے مزا ہی آجاتا ہے۔ اس طرح لڑھکتے ہیں جیسے اٹھا ہوا جنازہ گر پڑے۔ اکثر تو ان کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے میرا اپنا گھوڑا بدک گیا۔ اب تو کم بخت سکول سے بھاگے ہوئے بارہ تیرہ سال کے چھوکروں نے بھی، جن کے ابھی منہ چڑانے کے دن ہیں، یہ پھٹ پھٹیے جوت لیے۔ ایک وہ دن تھے جب ہم لاہور میں ہوتے تھے اور ہمارے پاس ہونڈا اسکوٹر تھا، جسے جہاز سے شرط باندھ کر چلاتے تھے تو دس دس کاروں کے اُوپر سے نکال لے جاتے تھے۔ یوں جیسے ہوائی میزائل اُڑتا جا رہا ہو۔

شاہ محمد نے پُرانی عادت کے موافق داستان کا پہلو نکال ہی لیا۔

وہ کیسے؟ میں نے تجسس ظاہر کیا۔

تانگہ اب شہر سے نکل کر کھلی سڑک پر رواں ہو چکا تھا۔ شاہ محمد نے گھوڑے کو ایک چھانٹا دکھایا اور بات شروع کر دی، ایک دن میں سکوٹر پر ہی تھا۔ سکوٹر بھی نیا نکور، زیرو میٹر تھا۔ بس ہاتھ کے اشارے سے اُڑتا۔ مَیں رواروی میں جا رہا تھا کہ سامنے سے دس بارہ لڑکے سکوٹر دوڑاتے آئے اور اگلے پہیے ہوا میں اُٹھاتے ہوئے زناٹے زن کر کے پاس سے نکل گئے۔ مجھے لگا لڑکے مجھے چھیڑ کے نکلے ہیں۔ بس اُسی وقت میرا بھی میٹر گھوم گیا اور میں نے کہا، لے بئی شاہ محمد تو بھی دکھا دے اِن کو اپنے جلوے۔ میں نے اُسی وقت سکوٹر واپس پھیرا اور پل کی پل میں لڑکوں کو جا لیا اور للکارا، لو بھئی اگر تم میں کوئی اپنے باپ کا صحیح نطفہ ہے تو آئے میرے برابر۔ بس پھر اُسی وقت دوڑیں لگ گئیں اور سکوٹر ہوا سے کھیلنے لگے۔ ہنستے ہوئے، حرامی وہ بھی پورے دنوں کے تھے۔ مجھے اِدھر اُدھر سے کٹیں مارنے لگے۔ کوئی آگے سے کوئی پیچھے سے۔ وہ تو چاہتے تھے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیں۔ اِدھر میں بھی اُن سے بچتا ہوا تیزی سے کٹیں مارتا جاتا تھا۔ بس یہ سمجھو ہم اُس وقت عزرائیل کے چاچے بنے ہوئے تھے۔ راہ گیر کی کیا حیثیت، ہمارے آگے بیل آ جاتا تو مارا جاتا۔ اس شیطانی دوڑ کی وجہ سے ایک ہی دفعہ پورے فیروز پور روڈ کی ٹریفک کناروں سے لگ گئی اور لوگ شکوے سہمے فٹ پاتھوں پر چڑھ گئے، کچھ دیواروں سے چپک گئے، مجھے اُن کی حالت پر ہنسی

بھی آ رہی تھی، مَیں کبھی اگلا پہیہ ہوا میں اُٹھا دیتا اور کبھی پچھلا پہیہ اُٹھا کر دوڑتا، عجب مداری پن پر اُتر آیا تھا۔ اسی بھاگم بھاگ میں اچانک مسلم ٹاؤن کی نہر آ گئی۔ اب خدا کا کرنا ایسا کہ اُس کا پُل بن رہا تھا، جس کی وجہ سے کئی مشینیں اور مزدور سڑک روکے کھڑے تھے۔ مزدور تو ہمیں دیکھ کر بھاگ نکلے، پر مشینیں کدھر جاتیں؟ اُنہیں دیکھ کر سب لڑکوں نے اپنے سکوٹر روک لیے لیکن میں نے دل میں کہا، شاہ محمد تیرا یہاں رُکنا تو ہین ہے۔ بس پھر میں نے ایک ہی دم سکوٹر کو دائیں ہاتھ پھیر کے جو ریس دبائی، سکوٹر نہر کے اُوپر سے اُڑتا ہوا نکل گیا۔ اُڑتے ہوئے مَیں ہاتھ ہلا کر انہیں اشارے کرتا گیا کہ بیٹا اب آؤ اگر تم میں جرات ہے۔ بس مَیں نکل گیا اور وہ بچارے اپنا منہ بغلوں میں چھپا کر وہیں رہ گئے اور اب ایک یہ رکشے والے ہیں، جو گدھی ریڑھی چلانے کے لائق بھی نہیں لیکن میرے گھوڑے کو بدکانے سے باز نہیں آتے۔ بس میاں، قیامت کے دن قریب آ گئے۔

اگر ان کے اتنے ہی ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں تو سواریاں ان کے ساتھ بیٹھتی کیوں ہیں؟ مَیں نے پوچھا

میاں نئے زمانے کو عقل ہوتی تو یہ سکوٹر کے پیچھے ڈبا باندھتی؟ شاہ محمد نے کہا، بھائی اگر جاپان والے آ کر دیکھیں کہ اِن لفنگوں نے اُن کے سکوٹروں کا کیا حال کیا ہے تو خدا کی قسم اِن کو ضرور عدالت میں گھسیٹیں اور عمر قید کی سزا دلوا کے رہیں۔ اب بتاؤ، یہ کوئی انصاف ہے؟ جو چیز ایک بندے کے لیے بنائی گئی اُس پر بیس لوگ چڑھا دو۔ بس اِس ملک کی ہوا ہی اُلٹی ہے اور لوگ بس گھاس کھاتے ہیں، اسی وجہ سے دماغ میں گوبر ہے۔

یہ تو چاچا بڑی خطرناک بات ہے۔ کیا تم سب کوچوانوں نے احتجاج نہیں کیا اِن رکشوں کے خلاف؟ مَیں نے تشویش ظاہر کی، ایسا نہ ہو کل کلاں یہ سارے اڈے پر ہی قابض ہو جائیں۔ اِن کو چاہیے تھا، اپنے بھٹ بھٹیوں کے لیے دوسری جگہ اڈا بناتے۔

لو، ، جوان کیسی باتیں کرتے ہو؟ اول تو کئی کوچوانوں نے گھوڑے بیچ کر یہی خرید لیے۔ اب وہ اپنے ہی خلاف احتجاج کیسے کریں۔ دوم، جو رہی سہاگن اُسی کا پاؤں بھاری۔ سواریاں اب تانگوں کی طرف منہ پھیر کر بھی نہیں دیکھتیں۔ جس کی وجہ سے ہمارا زور ٹوٹتا جا رہا ہے اور نوبت یہ آ گئی کہ ہفتہ پہلے کمیٹی والوں نے اُلٹا کوچوانوں کو دو مہینے کا نوٹس بھیج دیا ہے کہ تانگے اڈے میں زیادہ جگہ گھیرتے ہیں اور لید کی بُو بھی آتی ہے۔ اڈا رکشے والوں کو الاٹ کر دیا گیا ہے

اس لیے اپنا ٹھکانا ڈھونڈو۔ گھوڑوں کے پانی کا حوض چھ مہینے ہوئے، پاٹ دیا تھا۔ اب یہاں تانگے والے تو چھ آٹھ ہی رہ گئے۔ ہم اس نوٹس کو لے کر ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس گئے مگر انہوں نے صاف دھو کر جواب دیا، کہا، مَیں کمیٹی کے کام میں دخل اندازی نہیں کرتا۔ اب بندہ پوچھے، تُو دخل نہیں دے گا پھر تیری اماں دے گی، جس نے تجھے جَن کر ہماری قسمت میں لکھ دیا۔ مَیں نے تو وہیں کہہ دیا تھا، کمشنر صاحب، اگر تیرا بابا تانگا چلاتا ہوتا، پھر مَیں دیکھتا تُو ہمارے خلاف کیسے فیصلہ دیتا ہے۔ ہمیں پکی خبر ہے اُس نے کمیٹی والوں سے حرام کھالیا ہوگا۔

پھر؟ میں نے پوچھا

پھر ہم اللہ کو سونپ کر آ گئے اور اللہ کو سونپے ہوئے کاموں کا جو حشر ہوتا ہے، اُس کا تمھیں پتا ہی ہے۔

تو اب کیا ہوگا؟ مَیں نے تاسف سے پوچھا۔

ہونا کیا ہے، مَیں نے تو سوچا ہے، دو مہینے کے بعد تانگہ شہر لانے کی بجائے، بتی موڑ، پر ہی چلاؤں گا۔ وہاں ابھی تانگوں کا راج ہے۔

لیکن وہاں بھی دو سکوٹر رکشے آ گئے ہیں، میں نے کہا

آ تو گئے ہیں لیکن دیکھی جائے گی، شاہ محمد نے گویا ایک حل نکال لیا تھا۔

اس کے بعد میں پھر لاہور آ گیا اور تین چار مہینوں کے بعد گاؤں جانے لگا۔ اس عرصے میں میری ہر دفعہ شاہ محمد سے ملاقات ہو جاتی۔ وہ اپنا تانگہ شہر سے اُٹھا کر بتی موڑ کے اڈے پر لے آیا تھا۔ اس اڈے پر کمائی کم تھی لیکن شاہ محمد کو سواریاں بہر حال مل جاتیں اور دو سال تک حالات پُر سکون رہے لیکن کب تک؟ آہستہ آہستہ یہاں بھی سکوٹر رکشوں کا چلن عام ہو گیا اور شاہ محمد کا تانگہ بے کار رہنے لگا۔ مَیں جب بھی گاؤں جاتا اُسی کا تانگہ سالم کرا لیتا لیکن میرے اکیلے سے اُس کی کیا کمائی ہوتی۔ دو سال اس طرح مزید چلے، پھر جو ایک دن مَیں، بتی موڑ، پہنچا تو دیکھا، شاہ محمد بھی ایک رکشے پر بیٹھا سواریوں کا انتظار کر رہا تھا۔ مَیں حیران ہوا اور ایک گونا سکون بھی ہوا کہ چلو اچھا ہوا، اِسے سواریاں تو ملیں گی۔ سیدھا اُسی کے رکشے کی طرف بڑھا۔ اُس نے بھی مجھے دیکھ سکوٹر رکشا اسٹارٹ کر دیا۔ ایک دو رکشے والوں نے مجھے ہلکی سی تنبیہ کی، بھائی جان، ہمارے ساتھ آ جائیں، اِسے رکشہ چلانا نہیں آتا لیکن مَیں اُن کو نظر انداز کر کے شاہ محمد کے رکشے پر

بیٹھ گیا اور رکشہ چل پڑا۔ شاہ محمد کا دل باتیں کرنے کو بہت کرتا تھا مگر رکشے کا شور اتنا تھا کہ ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی خوشی سے سفر کرنا پڑا۔ اس سفر میں مَیں نے یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ رکشے والے ٹھیک ہی کہتے تھے۔ شاہ محمد کے ہاتھوں سے رکشہ ایک طرف نکل نکل جاتا اور کئی دفعہ سڑک سے گہری کھڈ میں گرتے گرتے بچا۔ مَیں پورے رستے دعائیں پڑھتا رہا اور دل میں آیندہ کے لیے اُس کے ساتھ بیٹھنے سے توبہ کر لی۔

اس کے بعد مَیں نے سنا کہ اُس کا رکشہ دو مہینے کے دوران ہی پورا ہو گیا۔ اتنے ایکسیڈنٹ ہوئے کہ پہیے، گراریاں، چھین، ہینڈل غرض ہر چیز کی ستیاناس پھر گئی۔ اس عرصے میں کئی سواریاں بھی پھٹڑ کیں، جس کی وجہ سے انہوں نے جلد ہی اس کے رکشے پر بیٹھنے سے توبہ پکڑ لی۔ ویسے بھی یہ سکوٹر رکشہ کسی کام کا نہیں رہ گیا تھا اور نہ ہی اب اُس کی عمر سکوٹر رکشہ چلانے کی تھی۔ مَیں اگلی دفعہ گاؤں آیا تو شاہ محمد گاؤں میں داخل ہوتے ہی، جو پہلا ہوٹل پڑتا ہے، وہاں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ مَیں کچھ دیر کے لیے اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ مجھے لگا، وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ عمر تو کچھ ساٹھ سے تھوڑی اُوپر تھی لیکن اتنا کمزور پہلے نہیں لگتا تھا۔ رنگ زرد اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، چائے کا کپ اُٹھاتے ہوئے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔ یقین نہیں آ رہا تھا، یہ وہی شاہ محمد ہے، جو کچھ عرصہ پہلے ہٹا کٹا اور زندگی سے بھرپور تھا۔ ایسی گری ہوئی صحت دیکھ کر مَیں نے پوچھا، چاچا شاہ محمد آپ کی صحت کو کیا ہو گیا؟

شاہ محمد نے چائے کے کپ سے نظریں ہٹائیں اور بولا، مجھے پتا تھا تُو یہی پوچھے گا، پر کچھ باتوں کا جواب نہ بھی دیا جائے، تو یار بیلی سمجھ لیتے ہیں۔

پھر بھی کچھ تو پتا چلے، حالات کی ٹوہ لیتے ہوئے دوبارہ پوچھ لیا۔

بھتیجے چھوڑ اِن باتوں کو، شاہ محمد ٹھنڈی آہ لے کر بولا، ہمارے روگ تیری سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ یہ صحت تو اُسی دن خراب ہو گئی تھی، جس دن گھوڑا بیچ کے لوہے کا جہنمی بھٹ بھٹیا خریدا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی تانگے کا کوئی خریدنے والا نہیں تھا۔ اگر یہ نشانی بھی بک جاتی تو شاہ محمد اتنی دیر نہ چلتا۔ خیر تُو اپنی سنا تیرا نوکری کا دھندا تو ٹھیک چل رہا ہے؟

جب رکشہ لے ہی لیا تھا تو بیچا کیوں؟ اچھی بھلی روزی روٹی چل رہی تھی؟

کہنے لگا، بیٹے کیا بولوں، تجھے تو پتا ہے ساری عمر ٹھاٹ سے رہے۔ تانگے پر بیٹھتا تھا تو

اُس کا ساڑھے پانچ فٹ کا پہیہ زمین سے اِتنا اُونچا ہوتا کہ پیدل لوگ چھوٹے چھوٹے لگتے۔ تانگے کے بمبو پر بیٹھتے ہی قد بڑھ جاتا۔ تانگہ نوابوں کی سواری ہے۔ لوگوں کے اصرار پر میں نے سکوٹر رکشہ خرید تو لیا لیکن جب اس کے ڈیڑھ فٹ پہیے والی پھٹ پھٹی پر بیٹھتا تو ایسے لگتا، زمین کے ساتھ گھسٹتا جا رہا ہوں۔ شرم کے مارے ڈوبنے کو جگہ نہ ملتی اور سوچتا، شاہ محمد ایسے رزق سے تو موت اچھی ہے۔ آخر اونے پونے بیچ کر اس ذلت پر لعنت بھیجی۔

مجھے شاہ محمد کی بات پر ہنسی آئی لیکن ضبط سے کام لے کر اُس کو دبا گیا۔ سچ تو یہ تھا کہ اب اُس کی عمر رکشہ چلانے کی رہی نہیں تھی اور نہ عمر بھر اُس نے ان چیزوں کو چھوا تھا مگر شاہ محمد کا یہ عذر مجھے اچھا لگا۔ آہستہ سے کچھ پیسے نکال کر شاہ محمد کی جیب میں ڈال دیے اور گھر چلا آیا۔ یہ میری اُس سے آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں کافی عرصہ کے لیے ملک سے باہر چلا گیا اور جب آیا، وہ دنیا سے جا چکا تھا۔

....

آج میرے قدم خود بخود اُس کے گھر کی طرف اُٹھ گئے اور جلد ہی وہاں جا کھڑا ہوا۔ اُسے فوت ہوئے پندرہ سال ہو چکے ہیں۔ میں اُس کے زمین بوس گھر کے سامنے اُس تانگے کو دیکھ رہا ہوں، جس کے بمبو آدھے رہ گئے ہیں، پہیوں کو دیمک کھا چکی ہے اور وہ ٹوٹ پھوٹ کر زمین میں دھنس چکے ہیں۔ سیٹیں اور لکڑی کی تختیاں کوئی نکال کے لے گیا ہے۔ وہ تانگہ ایک ایسا بدحال ڈھانچا ہے، جس کا نہ کوچوان موجود ہے اور نہ اُسے کھینچنے والا گھوڑا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے دیکھا، سکول سے نکل کر سیدھا اڈے کی طرف بھاگتا ہوا آیا ہوں اور شاہ محمد کے تانگے پر چڑھ کر بیٹھ گیا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد شاہ محمد نے گھوڑے کو چابک لگائی، تانگے کو گاؤں جانے والی سڑک پر چڑھایا اور ایک نئی کہانی شروع کر دی۔

اللہ دین کی چارپائی

اللہ دین کی چارپائی صبح سڑک کے کنارے جڑواں درختوں کی چھاؤں میں بچھ جاتی اور آٹھ دس موڑھے لگ جاتے۔ یہاں روزانہ کے بیٹھنے والوں کے علاوہ راہ گیر بھی رُک جاتے، گھڑی بھر حقہ گڑگڑاتے، لسی کا گلاس پیتے، پھر صافا جھاڑ کر کاندھے پر رکھتے اور آگے چل دیتے۔ دونوں درختوں کی شاخیں ایک دوسرے میں اس قدر پھنسی تھیں کہ گھنی چھاؤں کا ایک ہی پیڑ لگتا۔ ان کی شاخیں لچکیلی اور پتے سیاہی مائل سبز تھے۔ شاخیں پرندوں سے بھری رہتیں۔ کسی پرندے کی بیٹ اللہ دین یا دوسرے کی پگڑی پر گر جاتی تو وہ دو چار گالیوں کے ساتھ تالی بجا کر اُسے اُڑانے کی کوشش کرتا۔ کھال کے آگے ایک چوڑی سڑک تھی، جس پر جون جولائی کے دنوں میں تیز اور چمکیلے حرارے اس طرح دائروں میں اُٹھتے، جیسے دھوپ کے بھوت اُڑ کر آسمان کو چڑھ رہے ہوں۔ سردیوں میں سفید دھوپ ہلکی ہلکی حرارت پہنچاتی۔ سڑک کے دوسرے کنارے ہیرو موچی کا چھپر تھا۔ چھپر بھی کیا تھا، کوٹھے کی دیوار کے ساتھ لکڑی کے موٹے ڈنڈے گاڑ کر ان پر کپاس کی چھڑیاں رکھ دیں اور دیواروں کی جگہ ٹاٹ کی بوریاں لٹکا دیں۔ بوریوں پر وقفے وقفے سے پانی کا چھڑکاؤ کرتا رہتا تا کہ ہوا ٹھنڈی ہو کر اندر آئے۔ ہیرو موچی موٹے چمڑے سے دیسی جوتے بناتا۔ کام کرتے تھک جاتا تو اللہ دین کے پاس آ بیٹھتا، کچھ دیر حقہ پیتا پھر اُٹھ کر کام میں لگ جاتا۔ اکثر نئے جوتے پر کام کرنے سے پہلے اللہ دین سے مشورہ کرتا اور اُسے چمڑا دکھانا ضروری سمجھتا۔ جوتا بنوانے والے بھی ہیرو موچی سے جوتا لے کر پہلے اللہ دین کو دکھاتے۔ وہ جوتے کی اتنی تعریف کرتا کہ خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں خوش ہو جاتے۔ گاؤں کی بعض عورتیں بھی پھیری والوں سے کپڑے وغیرہ خرید کر سیدھی اللہ دین کی چارپائی کا رخ کرتیں اور کہتیں، وے اللہ دیتا، یہ کپڑا تو دیکھ کیسا ہے؟ پورے

چار روپے گز لیا ہے۔ الہ دین اُس کی اتنی تعریف کرتا کہ سننے والوں پر مبالغہ ہونے لگتا، کہتا، بھئی تم نے تو کپڑے والے کو لوٹ لیا ہے۔ اتنے سستے میں ایسا اچھا کپڑا خرید لیا۔ اس طرح کا کپڑا تو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ وہ خوشی سے بغلیں بجاتی چلی جاتی۔ ایک دفعہ الہ دین کی بیوی اماں فاطمہ نے کہا، یہ تم کیا ہر اچھی بری چیز کی تعریفیں کرتے رہتے ہو؟ بُری سے بُری شے کو بھی سونے چاندی سے ملا دیتے ہو۔

جواب میں الہ دین نے کہا، اُو بھلیے، اس میں میرا کیا جاتا ہے؟ اب جو چیز جس نے خرید لی ہے، وہ واپس کرنے سے تو رہی۔ اگر بُری بھی ہے تو میرے برا کہنے سے سوائے اس کا دل دکھنے کے اور تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس سے تُو ہی بتا مجھے کیا ملے گا؟ رہی اچھی یا بُری ہونے کی بات، آخر دونوں کو فنا ہے۔

الہ دین کی چارپائی کے نیچے پانی کی کھال اور درختوں کی چھاؤں سے گرمی کے دن نہایت آرام سے کٹتے۔ وہ اُٹھ نہیں سکتا تھا کہ دس سال پہلے ہونے والی گٹھیا نے اُسے چارپائی سے لگا دیا تھا۔ اس کے باوجود اُس کے سب بیٹے اتنا ادب کرتے کہ ہلکی سی آواز پر دوڑے چلے آتے۔ ذرا سی دھوپ پڑنے پر چارپائی اُٹھا کر چھاؤں میں کر دیتے۔ کھانا وقت سے لمحہ بھر اِدھر اُدھر نہ ہوتا۔ مُنجھ کی کھری چارپائی پر کپاس کے دھاگے سے بُنی ہوئی چادر اور تکیہ اتنے صاف اور سفید تھے کہ ان پر دھوپ کا گمان ہوتا۔ اُسی تکیے کے سہارے بیٹھا الہ دین سفید لٹھے کے لباس اور سفید پگڑی باندھے کسی نواب سے کم نہ دکھائی دیتا۔ کڑوا تمباکو اور ٹھنڈی لسی پاس بیٹھنے اور ملنے والوں کے لیے ہر صورت مہیا رہتی۔ سڑک پر دن بھر میں ایک آدھ گڈھ یا پھیری لگانے والا گزر جاتا۔ باقی اللہ اللہ۔

چارپائی کے گرد پڑے موڑھوں پر بیٹھنے والوں میں شریف کھوکھر، متا بھٹی، اسماعیل بھٹی، شیدا بھیر، طفیل باجوہ، بابو رجب علی، جمال بھٹی اور دوسرے دو چار لوگ ایسے تھے کہ اُن کو موت ہی ناغہ کرائے تو کرائے۔ ہر ایک کے پاس سنانے کو پرانے وطن کی بے شمار داستانیں تھیں۔ ہجرت کو چودہ سال گزر جانے کے بعد بھی نئے دیس کی ان کے پاس کوئی بات نہیں تھی۔

....

جمال بھٹی نے بیٹھتے ہی سامنے والے موڑھے کو کھینچ کر آگے کیا اور کاندھے سے پٹکا

اُتار کر اُس پر رکھ دیا۔ پھر سر سے پگڑی اُتار کر زانوؤں پر رکھی اور حقّے کی نے اپنی طرف کھینچ کر بولا،
بھئی الہ دین، وطنوں کے قصے بھی عجیب ہیں۔ بھلا اُجاڑے سے پہلے کسی کو پتا تھا یوں دیس دیس
مارے پھریں گے؟۔ فیروز پور میں چوری چکاری کا چنگا بھلا کاروبار تھا اور عزت کی روٹی کھاتے
تھے۔ توبہ کر کے کہتا ہوں، اِن ہاتھوں سے سینکڑوں روپے گنے۔ خدا جھوٹوں کو اُٹھنے سے پہلے قبض
کرے، فیروز پور کی پانچ تحصیلوں میں کون تحصیل ایسی ہوگی جہاں سے ڈھور ڈنگر گھیر نہ لائے ہوں۔
اُس وقت چوری مردوں کا گہنا تھی۔ بس الہ دین ساری عزت اور محنت کی کمائی اُجاڑے نے کھالی،
سب کچھ لٹا کر ملو جھاڑ اور یہاں چلے آئے۔ ہاتھ کی ڈنگوری اور یہ کاندھے کا پٹکا بچا اِس تباہی میں۔
بابا الہ دین جو اپنے تکیے سے سہارا لیے بیٹھا تھا، تھوڑا سا اور سیدھا ہوا اور ہنس کر بولا،
جمالے شکر کر تُو سلامت چلا آیا۔ اِس قیامت میں زندہ بچ کے نکل آنا بھی ولی اللہ ہونے کی نشانی
ہے۔ جان ہے تو جہان ہے، قسمت میں لکھا ہے تو پھر فیروز پور میں چلے جائیں گے۔ ویسے
اُجاڑے میں جس طرح تُو کا چلا ہے، تیری گردن تو اس کی پوری حق دار تھی۔
الہ دین کی بات پر سب ہنسنے لگے۔
الہ دین نے کہا، جمالے اُن خچروں کی کیا کہانی تھی؟ ذرا ہمیں بھی تو بتا۔
جمال دین اس بات پر کھسیانا سا ہو کر ہنس پڑا، جیسے الہ دین نے اُس کی کمزور رگ پکڑ
لی ہو۔ اُس نے بات بدلنا چاہی لیکن اب دوسرے لوگوں کا اصرار بھی بڑھ گیا کہ پہلے الہ دین کی
بات کا جواب دو۔ آخر مجبور ہو کر جمال دین نے ہلکا سا کھنگھار لے کر گلا صاف کیا اور حقّے کی نے
حیات علی کو تھما کر بولا، ایک دفعہ ہوا یہ کہ کافی عرصہ ہمیں کسی گائے بھینس کھولنے کا موقعہ نہ ملا۔ میں
اور اللہ رکھا (خدا اُسے رب رسول کے واسطے جنت میں جگہ دے، اُجاڑے میں سکھوں کی کرپان
کے صدقے چڑھ گیا) ہم دونوں مال کی تاڑ میں پھرتے پھراتے روہی جا نکلے۔ وہاں ہمیں خچر
ہاتھ لگ گئے۔ الہ دین تمھیں تو پتا ہے روہی کے خچروں کا، کتنے بڑے اور موٹے تازے تھے۔
روہی کا چھولیا کھا کھا کے ڈنبے کی طرح اُن کی چکلیاں نکلی ہوئی تھیں۔ اُس وقت ہمیں اُن کی
قیمت کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نے اللہ رکھا سے کہا، میاں رکھے اِن گدھوں کا ہم کیا کریں گے؟ اُس
نے کہا، بھئی جو چار چھ روپے ہاتھ آئیں۔ اب اور کچھ نہیں ملتا تو بھوکے مرنے سے بہتر ہے اِنھی کو
کھول کر لے جائیں۔ چنانچہ ہم وہ خچر لے آئے۔

اب ہمارے لیے مسئلہ پیدا ہوا کہ یہ کھوتے کہاں ٹھکانے لگائیں۔ بڑی سوچ بچار کی۔ شرم کے مارے کسی کو بتاتے بھی نہ تھے کہ لوگ کہیں گے اب جمال کھوتے چوری کرنے لگا، ڈوب کے مر جائے۔ اسی نموشی میں کئی دن گزر گئے۔ پھر اچانک مجھے ایک طریقہ سوجھا۔ میں نے سوچا، ہم یہ مال عیسیٰ اور ولاور کو دے دیتے ہیں۔ مال کے بدلے میں مال کے طور پر۔ الہ دین عیسیٰ اور ولاور کو تو جانتے ہو؟ یہ دونوں بھی بڑے کاری گر چور تھے۔

ایسے ویسے چور،، جمالے میں تھوڑی دیر کے لیے تیری بات کاٹتا ہوں اور ایک چھوٹا سا واقعہ عیسیٰ اور ولاور کا سناتا ہوں، بابے الہ دین نے اپنی پگڑی کو سر سے تھوڑا سا میز ھا کر کے خارش کی اور دوبارہ پگڑی درست کی، ان دونوں کا ایک بڑا بھائی شبر علی تھا، جو آج کل لائل پور میں ہے۔ یہ چوری چکاری سے ہمیشہ دور رہتا اور روائی بیجی کی محنت کر کے کھاتا تھا۔ عیسیٰ اور ولاور جب بھی مال مار کر لاتے، دو تین دیگیں چاولوں کی پکا کر اللہ کے نام پر غریب غربا کو کھلاتے۔ اس کے خرچے کا تیسرا حصہ بھائی ہونے کے ناتے یہ شبر علی سے بھی وصول کرتے۔ اب ان کا مال تو لوٹ مار کا ہوتا مگر شبر بچارے کو اپنے خون پسینے کی کمائی سے حصہ ڈالنا پڑتا۔ دو تین سال وہ حصہ بھرتا رہا، آخر کب تک ساتھ نبھاتا۔ ایک دن تنگ آ کر کہنے لگا، بھائیو، خدا اسی طرح راضی ہوتا ہے تو مَیں دوزخ میں ہی اچھا ہوں۔ آئندہ تم اور تمھارے خدا سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح اُس بچارے نے اپنی جان چھڑائی۔

الہ دین کی بات پر سب ہنس پڑے۔ اس کے بعد جمال بھٹی نے حقے کا ایک تازہ گھونٹ بھر کر بات وہیں سے جوڑ دی، تو مَیں کہہ رہا تھا بھائی اسماعیل، یہ دونوں بھائی ریاست پٹیالہ سے مال چوری کر کے فیروز پور میں لا بیچتے۔ ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے ہمارے کھوتوں کے ساتھ اپنی گائے بھینسوں کا سودا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن ہم نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ برابر برابر اُن سے سودا کر لیا۔ یعنی تین خچروں کے عوض تین گائیں۔ اس کامیاب سودے کے بعد ہم نے روہی کے خچروں پر ہی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا اور جی میں بڑے خوش کہ ہم عیسیٰ اور ولاور کو دھوتی دے رہے ہیں۔ ہم روہی کے خچر چوری کر کے اُنھیں دیتے رہے اور وہ اُن کے بدلے پٹیالہ کی گائیں بھینسیں ہمیں دینے لگے۔

یہ کام تین سال چلتا رہا اور ہم اُن کو اِس طرح احمق بناتے رہے۔ ایک دفعہ ہم خچر لے کر آ رہے تھے کہ بنگلہ فاضلکا میں ہمیں ایک کمہار مل گیا۔ اُس نے کہا کہ یہ دونوں خچر مجھے بیچو گے؟

ہم نے کہا، کہیں تو بیچنے ہیں، تم لے لو۔ وہ بولا، قیمت بتاؤ؟ میں نے کہا تم خود ہی بتا دو؟ اُس نے کہا دونوں کے ڈھائی سو لے لو۔ یہ سنتے ہی ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ اُس وقت اچھی سے اچھی گائے کی قیمت پچاس روپے سے زیادہ نہیں تھی۔ اب مجھے پتا چلا کہ جسے ہم گدھا سمجھتے رہے وہ تو گائے سے تین گنا قیمتی تھا اور عیسیٰ ہمیں بدھو بنا کر کتنا عرصہ ہمارا کباڑہ کرتا رہا۔

جمال کی اس بات سے سب ہنس ہنس کر دوہرے ہونے لگے۔ بابے الہ دین نے ہنستے ہوئے پوچھا، پھر کیا تم نے عیسیٰ سے حساب کتاب کیا؟

حساب کیا کرتا میاں الہ دین، جمال تاسف سے بولا، اس کے بعد تو کچھ رہا ہی نہیں۔ اُجاڑے پڑ گئے اور وہ دونوں بہشتی تحصیل مکھسر میں سکھڑوں کے ہاتھوں حلال ہو گئے۔ بس الہ دین جس طرح روزے مسلمانوں پر فرض کیے گئے، اسی طرح میری قسمت میں نقصان فرض کیا ہے۔ لیکن سچ پوچھیں تو مجھے اُن کے مرنے کا بہت دُکھ ہوا۔ خدا جانتا ہے بڑے جی دار آدمی تھے۔ ایک دفعہ جھنڈے پور میں لٹھ بازی کے مقابلے میں اُس نے پورے دس لٹھ بازوں کو ہرایا تھا۔ ہاااااا، بس رہے نام اللہ کا۔

سورج اب ماتھے کے کناروں پر آ لگا تھا۔ درختوں نے اپنی چھاؤں سمیٹ کر بغل میں دبا لی۔ اُسی وقت بابے الہ دین کا چھوٹا بیٹا منیر باہر نکلا اور الہ دین کی چارپائی کھینچ کر مزید درخت کے تنے کے ساتھ لگا دی تاکہ دھوپ نہ پڑے۔ اس کے بعد ٹھنڈی لسی کا ایک بڑا دونا بھر لایا، جس سے سب نے ایک ایک تانبے کا چھنا بھر کر پیا۔ اس طرح سب پھر تازہ دم ہو گئے اور نئے سرے سے باتوں کے طوطے اُڑنے لگے۔

بابو رجب علی پرانے لوگوں کی کیا بتاؤں، الہ دین نے حقے کا ایک لمبا گھونٹ بھر کر اُس کی نے مستا کی طرف سرکاتے ہوئے کہا، بس سادہ لوح بندے تھے۔ فائدہ نقصان اُن کی ضد میں تھا، اگر ضد پوری ہو جائے تو فائدہ ہی فائدہ۔ اب میرے باپ خوشی محمد ہی کو دیکھ لو۔ اللہ جنت نصیب کرے، اُن کا دماغ بھی اپنا ہی تھا، مجال ہے کسی کی بات مان جائیں۔ اُجاڑے سے آٹھ سال اُدھر کی بات ہے۔ اُس دفعہ بارشیں بہت ہوئیں اور روہی میں بارش ہونے کا مطلب وافر غلہ تھا۔ روہی میں چنے کی فصل کا سیلاب آ گیا۔ اس بار ہماری فصل تین ہزار من ہوئی۔ فیروز پور کی منڈی کافی دور تھی۔ تحصیل مکھسر دس کوس پر تھی۔ اُس وقت دو بیل گڈے ہمارے پاس تھے۔ اُن پر اِتنا غلہ لاد کر

لے جانا بہت مشکل تھا۔ ہری چند کھتری میاں جی کے پاس آیا اور ایک روپیہ فی من کے حساب سے پورا غلہ گھر سے اُٹھانے کا سودا کر لیا۔ میاں جی نے کہا کل بتاؤں گا۔ اُس کے جانے کے بعد میاں جی نے منڈی سے ریٹ معلوم کرنے کے لیے بندہ بھیج دیا۔ پتا چلا کہ منڈی کا ریٹ ایک روپیہ چار آنے ہے۔ پھر کیا تھا، میاں جی کا لاٹو گھوم گیا۔ اُنہوں نے کہا، غلہ مَیں خود منڈی لے کر جاؤں گا۔ اس کھتری کو چار آنے کس بات کا منافع دوں؟ اب ہزار طرح سے اُن کو سمجھانے والے، کہ میاں جی غلہ کھتری کو بیچ کر سر دردی سے بچو۔ کس جھنجھٹ میں پڑنے والے ہو۔ مگر اُن کی جوتی سنے۔ بنگلہ فاضلکا میں اُس کا بیلی رفیا کمہار تھا، اُس کو بلا بھیجا اور تین آنے فی من کے حساب سے مکھسر کی منڈی میں غلہ پہنچانے کا اُس سے معاہدہ کر لیا۔ وہ تیسرے دن ہی سو گدھا اور پندرہ بندے لے کر آ گیا۔ غلے کو گدھوں پر مکھسر کی منڈی میں ڈھونا شروع کر دیا۔ چل سو چل، پندرہ بندوں کی تین وقت کی روٹی اور سو گدھے کا چارہ بھی ہمارے ذمے تھا اور ساتھ روز کا پانچ روپے خرچ۔ سبز چارہ اُس وقت تھا نہیں۔ چنانچہ گدھے بھی چنے کھاتے اور بے حساب کھاتے۔ پورے ڈیڑھ مہینے میں پتہ نہیں، سو گدھوں اور پندرہ بندوں نے کتنے چنے اور کتنی روٹیاں کھائیں اور ہمیں کیا بچا؟ بس یہ ہوا کہ میرے والد میاں خوشی محمد کی ضد پوری ہو گئی۔ ڈیڑھ مہینے بعد رفیے کمہار کو تین آنے فی من کی مزدوری اور ایک آنہ فی من کے حساب سے انعام دے کر رخصت کیا۔ اور بڑے فخر سے کہنے لگے، دیکھ لو، اِسے کہتے ہیں عقلمندی۔ کھتری خوانخواہ میں چار آنے بچا رہا تھا۔

اتنے میں بابے کے منجھلے بیٹے نے باہر آ کر کہا، میاں جی روٹی تیار ہے۔ اِس کا مطلب تھا، دوپہر کے سورج نے عصر تک چھٹی کا گھنٹہ بجا دیا۔ سب اُٹھ کر اپنے گھروں کو چل پڑے۔ اللہ دین کا بیٹا اُسے اُٹھا کر گھر لے گیا اور چار بجے سہ پہر تک محفل برخواست ہو گئی۔

....

گاؤں میں نہ کسی کے پاس ریڈیو تھا اور نہ ہی اخبار کی آمد لیکن گاؤں شہر کے نزدیک تھا۔ اس لیے روزانہ کوئی نہ کوئی خبر پہنچ جاتی۔ جس پر اُس وقت تک گفتگو چلتی جب تک اگلی خبر نہ پہنچ جاتی۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب پاکستان بنے ابھی بارہ تیرہ سال ہوئے تھے۔ برلہ ٹیکسٹائل مل کی وجہ سے سرخ انقلاب کی باتیں شہر کے گلی محلوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ بابے اللہ دین کی محفل میں بھی اکثر اُس کے متعلق خبریں پہنچتیں، جو زیادہ تر راؤ اصغر کی زبانی بیان ہوتیں۔ اللہ دین کے پاس راؤ اصغر کے آنے

کا وقت ٹھیک چار بجے سہ پہر کا ہوتا۔ اُس کی ہر خبر کو اِس لیے مستند سمجھا جاتا کہ ایک تو وہ پوری آٹھ جماعتیں پڑھا تھا، دوم اُس کے پاس گاؤں میں ولایتی شکر کا ڈپو تھا۔ اس سلسلے میں اُسے اکثر شہر جانا ہوتا۔ جہاں سے وہ ضرور کوئی نہ کوئی خبر لے آتا اور جلدی سے الہ دین کی چار پائی کا رخ کرتا۔

دور سے راؤ اصغر دائیں ہاتھ سے اپنی دھوتی کے پلو اڑستا ہوا آتا دکھائی دیا۔ دھوتی کیا، دو گز کی لنگی تھی، جو ہمیشہ گھٹنوں سے اُوپر ہی اُوپر رہتی۔ پاؤں میں ٹائر کے جوتے، جو دور سے ہی کھٹ کھٹ بج رہے تھے۔ پاس آکر کرتے کی آستین سمیٹی اور ایک موڑھے پر ٹِک گیا۔ حقے کے تین چار کش لیے، ایک بھرپور نظر اِدھر اُدھر بیٹھے لوگوں پر ڈالی، پھر الہ دین کی طرف منہ کر کے بولا، میاں الہ دین! بس اب کچھ ہی دن رہ گئے گریبوں کی تقدیر بدلنے کے۔ روس نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان میں لال جھنڈا اب لگا ہی دیا جائے۔ روس کے صدر نے خط لکھا ہے کہ جلدی سے گریبوں کو دن میں تین مرتبہ روٹی اور گھر دے دو، ورنہ ہم چار مہینوں کے بعد خود آکر حکومتاں کریں گے۔

کچھ دن اور تنگی کاٹ لو۔ پھر تو ہر شے مفت راشن میں آئے گی۔ برابر دال بٹا کرے گی۔ میاں اللہ دین ان ڈاکوؤں اور سرمایہ داروں سے جان چھٹے گی، جنہوں نے یہیں بیٹھے بیٹھے مہاجر بن کے کئی کئی لائمیں نام کرا لیں اور ملوں کے مالک بن گئے۔ اللہ قسم، سب کچھ اِس ملک کا یہاں کے شہر میں رہنے والوں نے اور وہاں سے آنے والے شہری مہاجروں نے لوٹ لیا۔ دیہاتیوں کے ہاتھ میں ڈگڈگی دے دی، کہ لو، بجاتے پھرو۔ اب روس اِن سے نپٹے گا۔

راؤ صاحب یہ ہر روز جو آپ سرمایہ دار سرمایہ دار کرتے رہتے ہو۔ آخر یہ ہے کیا بلا؟ مشتاق جلا ہے نے حیرانی سے سوال کیا، مَیں نے بھی آخر بڑی دنیا پھری ہے۔ فیروز پور، لدھیانہ، منٹگمری، ہر جگہ گیا ہوں اور چین چین کا پانی پیا ہے لیکن اِس جانور کو نہیں دیکھا۔

اس سے پہلے کہ راؤ اصغر مشتاق کے سوال سے چکرا جاتا، اُسی لمحے حبیب آرائیں بول پڑا، لو جی، اِس کو دیکھو، یہ جلاہے کا جلاہا ہی رہا۔ اب جس کو سرمایہ دار کا نہیں پتا، اُسے اپنے سر کا پتہ ہے۔ سر کا معنی، سر، اور مایا کا معنی پیسہ، اور دار کھوتے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جس گدھے کے سر پر پیسوں کی پنڈ ہو، اُسے سرمایہ دار کہتے ہیں۔ حبیب کی اِس وضاحت پر سب اُسے تحسین سے دیکھنے لگے۔ راؤ صفر نے بھی اُس کی تائید میں سر ہلا دیا۔

اسماعیل بھٹی جس کے دو ہی کام تھے۔ پانچ مرتبہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنا اور پائے کا

شور بہ پیتا، اُس نے راو اصغر کی بات سن کر پہلے سر سے پگڑی اُتار کر زانو پر رکھی پھر تسلی سے شفاف ٹنڈ پر اپنی انگلیوں سے خارش کی اور پگڑی کو درست کر کے فکر مندی سے بولا، راو صاحب! یہ ساری بات تو تیری ٹھیک ہے، پر سنا ہے، روس والے پکے کافر ہیں، آ گئے تو مسجدیں بند کر دیں گے، نماز پڑھنے والوں کو کوڑے ماریں گے اور حلال گوشت بھی نہیں ملے گا۔ اسماعیل کی بات سن کر ایک دفعہ سب گھبرا گئے اور فکر مندی سے بابے الہ دین کو دیکھنے لگے۔ راو اصغر نے سب کو بدکتے محسوس کیا تو فوراً ہنستے ہوئے بولا، اسماعیل تمھیں کس نے کہہ دیا وہ کافر ہیں؟ تم بھی کاٹھ کے اُلو رہے۔ بس شورہ پی لیا اور لیٹ گئے۔ او بھائی، وہ مسلمان ہیں مسلمان، گوشت کھاتے ہیں، سر پر ٹوپیاں رکھتے ہیں اور یہ جو سرخ جھنڈا ہے، یہ علَم ہے علَم۔ امام حسین کا جھنڈا پہلے لال ہوتا تھا، پر تجھے کیا پتا؟

اب دوسرے لوگوں کو بھی حوصلہ ہوا اور وہ بھی اسماعیل کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ الہ دین، جو معذوری کے سبب چار پائی پر سیدھا ہو کر نہیں بیٹھ سکتا تھا، تکیے کا سہارا لے کر پائیں کی جانب سرکا۔ اسماعیل سمیت سارا مجمع الہ دین کی بات سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا۔ سائیں لوکا، الہ دین حقے کی نے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا! مجھے یہ بتا، اگر وہ مسلمان نہ ہوتے تو انھیں کیا ضرورت تھی غریبوں کو کھانا اور گھر دینے کی؟ جو ہمارے نبی نے کہا ہے وہ پورا پورا تول کر وہی کچھ کر رہے ہیں۔ اسی لیے تو امام حسین کے علَم کا نشان لال جھنڈا اُن کے پاس ہے۔ دوسری بات، اگر وہ کافر ہوتے تو ایران کا بادشاہ اُن کے ساتھ کیوں صلح صفائی سے رہتا؟

حیات دین جو ساری بات غور سے سن رہا تھا، اُس نے ہلکے سے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا، پر میاں الہ دین پرسوں شیخ غلام کہہ رہا تھا، وہ شراب بھی پیتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ لوگ دوبارہ روس سے بدظن ہوتے، راو اصغر ہنس کر بولا، حیاتے اگر تو سال سال بغیر نہائے اور دن رات افیم کھا کر مسلمان رہ سکتا ہے، تو وہ کیوں نہیں مسلمان رہ سکتے؟

راو اصغر کی اس پھبتی پر سب نے زوردار قہقہہ لگایا اور حیات خاں کھسیانا سا ہو کے حقہ پینے لگا۔ اس کے بعد راو اصغر اٹھ کر چلا گیا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی پہنچا تھا کہ شیدا بنیرا ایک بنیرے کو سہلاتے ہوئے آن بیٹھا۔ اُس کے ایک کندھے پر گلابی رومال تھا، جسے وہ روزانہ اپنے ہاتھ سے دھوتا۔ اور کاندھے پر ڈال لیتا لیکن دوسرے کپڑے ہفتے بعد ہی بدلتا۔ باپ سے آٹا پینے کا خراس

وراثت میں ملا تھا جس کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ چھتر کے پڑ گھس گھس کر آدھے رہ گئے تھے اور اُونٹ کے خوراک کی کمی کی وجہ سے جگہ جگہ کوہان نکل آئے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ شیدے کو سوائے بیٹروں کے کسی بات سے علاقہ نہیں تھا۔ بابے الہ دین کے پاس آ کر بیٹھنے والا ہر شخص اپنی ذات میں عجوبہ تھا لیکن شیدے بیٹر کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اسے دیکھ کر ہر شخص چہک اٹھتا۔ شیدا بیٹرا ابھی بیٹھا ہی تھا کہ چراغ ارائیں آ گیا۔ دونوں کی خوب لگتی تھی، اس لیے محفل خوب گرم ہو گئی۔ الہ دین نے شیدے سے اُس کے بیٹرے کا حال احوال پوچھا اور ابھی وہ جواب دینے ہی لگا تھا کہ چراغ بول پڑا، الہ دین، بیٹرے کا حال کیا ہو گا۔ اس بچارے کی جان تو اس کے ہاتھوں کی بدبُو سے ہی قبض رہتی ہے۔

چراغ کی پھبتی پر سب ہنس پڑے لیکن شیدے بیٹر نے ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ چراغ ارائیں کی بولتی بند ہو گئی، بولا! دیکھ الہ دین اس تھوم خور کو سمجھا، جس کی بیوی صرف اس لیے طلاق لے گئی کہ یہ رات کو پادیں مار مار کر اُس کو ہیضہ کر دیتا اور بچاری کو سونے نہیں دیتا تھا۔ اسی لیے اُس کی بیماری نہیں جاتی تھی۔ بچاری سارا دن باولی باولی پھرتی رہتی۔ آخر اس نے سوچا، جان ہے تو خاوند بہت اور چھوڑ کر چلی گئی۔ مگر اس ڈھیٹ کو شرم نہ آئی۔ اسی بیٹرے کی قسم، مَیں ہوتا تو نیلا تھوتھا کھا کے مر جاتا۔ مگر مَیں بھی کس کو کہہ رہا ہوں؟ یہ باتیں تو غیرت مندوں کے لیے ہیں۔

شیدے کے جوابی حملے پر سب کی طرف سے زوردار قہقہہ لگا اور چراغ ارائیں بچارا بجھ گیا۔ انہی قصوں، آپ بیتیوں اور جگ بیتیوں میں بابو رجب علی کی شاعری چل پڑتی جس پر خاص کر مشتاق جلاہا جھوم جھوم کر واہ واہ کرتا۔ شام چھ بجے چونکہ لوگ اپنے کام کاج نپٹا کر فارغ ہو جاتے تھے۔ اس لیے پورے دن کے معمول سے آٹھ دس لوگ اور بڑھ جاتے اور یہی وقت بابو رجب علی کی شاعری کا ہوتا۔ بابو رجب علی کا دادا پہلے پہل مسلمان ہوا تھا اس لیے لہجہ خالص سکھ تھا، جس میں رجب علی کمشری پڑھتے ہوئے لہریں لیتا نظر آتا۔ حتیٰ کہ عشا کی اذان اس محفل کو برخواست کروا دیتی۔

....

میاں جی کو چارپائی پر پچیس سال ہو گئے تھے۔ اس عرصے میں اُن کے ساتھ والے پنچھی ایک ایک کر کے اُڑ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ منگل وار آٹھ جولائی کا دن تھا۔ گرمی سے زمین

کا سینہ تپ کر ایسا، جیسے آگ پر تا ناچڑھا ہو اور سورج کی شعاعیں آری تو ایک طرف پانی کا کلیجہ چیر رہی تھیں۔ میاں جی کی چار پائی معمول کے مطابق مَیں خود درختوں کی چھاؤں میں رکھ کر اور موڑھے بچھا کر کام پر چلا گیا۔ اُس دن مجھے رینالہ جانا تھا اور نذیر ہمیشہ کی طرح آج بھی گھر پر نہیں تھا۔ اماں رفیق کے ساتھ اُس کے سسرال گئی تھی۔ مجھے یقین تھا مَیں دوپہر تک لوٹ آوں گا مگر دیر ہوگئی۔ میاں جی کی مجھے فکر تو کافی تھی لیکن تردد اس لیے زیادہ نہیں تھا کہ آس پاس بیٹھنے والے اُس کی خبر رکھیں گے۔ لیکن مَیں جو تین بجے سہ پہر وہاں پہنچا تو کلیجہ دہل کر رک گیا۔ کیا دیکھتا ہوں، میاں جی اکیلے چار پائی پر بیٹھے ہیں۔ کوئی آدم زاد وہاں موجود نہیں اور وہ چار پائی پر بیٹھے دھوپ کی کڑاہی میں پک رہے ہیں۔ جولائی کی اس سخت دھوپ میں معذور اور اُٹھنے سے لاچار میاں جی اپنے ہی پسینے میں بار بار بھیگ رہے تھے اور بار بار سورج کی آگ اُسے بھاپ بنا کر اڑا رہی تھی۔

بیٹا کیا بتاوں، اُس دن تیرے دادا کو یوں دھوپ کے آگے لاچار دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی۔ دل دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ جی چاہا سڑک پر ٹکریں ماروں اور ایسا پاگل پن چھایا کہ سڑک پر کھڑے ہو کر گاؤں والوں کو گالیاں دینے لگا کہ میاں جی دھوپ میں جلتے کسی کو نظر نہ آئے؟ حرامزادے دیکھ کر گزرتے رہے اور کسی نے چار پائی اُٹھا کر چھاؤں میں نہیں کی۔ اسی غصے اور باؤلے پن میں کئی گالیاں میاں جی کو بھی دے گیا کہ اُس نے کسی راہگیر کو کیوں نہیں کہا، چار پائی اُٹھا کر سائے میں کر دے۔ میاں جی سر نیچا کیے مسلسل چپ بیٹھے میری گالیاں سنتے رہے اور کچھ منہ سے نہ بولے۔ اسی غصے میں اُن کو اُٹھایا اور گھر کی طرف لے کر بھاگا۔ جسم اتنا گرم تھا، ایسے لگا جیسے مَیں نے آگ کے کوئلے پکڑ لیے۔ جلدی سے لے جا کر نلکے کے نیچے بٹھایا اور ٹھنڈا پانی اُوپر پھینکنے لگا۔ پانی پھینکتا جاتا تھا اور لوگوں کو گالیاں دیتا جاتا تھا۔ نہلانے کے بعد مَیں نے اُنھیں گھر میں موجود شہتوت کے نیچے بٹھایا اور بڑی دیر تک دستی پنکھا جھلتا رہا اور بڑبڑاتا بھی رہا۔ اس کے بعد مٹی کی کوری چاٹی سے پیتل کے دو گلاس ٹھنڈی لسی کے بھر کر پلائے اور کھانا کھلایا۔ اس سارے عرصے میں وہ بالکل بھی نہیں بولے۔ اتنے میں پانچ بج گئے اور اماں بھی آ گئی۔ مَیں اس قدر شرمندہ تھا کہ اماں سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔ اماں جو سارا دن میاں جی کی پل پل خبر رکھتی، آج ہی گھر نہ تھی تو اُس کی یہ حالت ہوگئی۔ مَیں خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ اماں کو کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔ دوسرے دن مَیں صبح اذان کے وقت اُٹھا کہ میاں جی کا

حقہ تازہ کر دوں۔ صبح کاذب کے حقہ تازہ کرنے کا کام برسوں سے میرے ہی ذمے تھا۔ جب مَیں نے حقے پر چلم رکھ کر اُن کی چار پائی کے پاس رکھا تو اُنہوں نے مجھے کہا، بیٹا یہاں بیٹھو۔ اب میرا کل والا جوش ٹھنڈا ہو چکا تھا اور پورے حواس میں تھا۔ اس لیے ڈرنے لگا کہ میاں جی پتا نہیں کیا کہیں؟ ڈرتے ڈرتے ادوائن کی طرف بیٹھ گیا۔ وہ آہستہ سے بولے، بیٹا مجھے ایک بات بتا، تم لوگوں نے میری کتنے سال خدمت کی ہے؟

مَیں چپ رہا اور کچھ جواب نہ دیا۔ آنکھیں بھی نیچے کیے رکھیں۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ خود ہی بولے، دیکھ بیٹا، آج اِس چار پائی پر مجھے پچیس سال ہو گئے۔ اِس عرصے میں تم نے اور تمھاری ماں اور بھائیوں نے میری خدمت کا حق ادا کر دیا۔ جس کا اجر خدا ہی کے پاس ہے لیکن دنیا کانچ کے پیڑ کی طرح ہے۔ جس کا نہ تو سایہ ہے اور نہ ہی اس کا پھل ہضم ہوتا ہے۔ اگر کل مَیں کسی کو کہہ دیتا کہ میری چار پائی چھاؤں میں کر دے۔ وہ چار پائی تو چھاؤں میں کر دیتا مگر سارے گاؤں میں کہتا پھرتا، دیکھو بھائی، خون سفید ہو گیا ہے، اللہ دین کے پانچ بیٹے ہیں مگر وہ بیچارا دھوپ میں لاچار پڑا جل رہا تھا۔ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ مَیں نے اُس کی چار پائی اُٹھا کر سائے میں کی اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ بس خدا کسی کو نافرمان اولاد نہ دے اور معذور ہونے سے پہلے ہی اُٹھا لے۔

بیٹا مجھے بتا، پھر تمھاری ساری عمر کی خدمت اور میری عزت بازاروں میں کس بھاؤ بکتی؟ اور دنیا کے آگے میرا کیا وقار رہتا؟ لیکن کل مَیں اس لیے چپ رہا کہ غصے میں آدمی کا دماغ کسی بات کو نہیں مانتا۔

میاں جی کی اس بات میں ایسی شفقت اور محبت تھی کہ میرے آنسو نکل آئے اور مَیں رونے لگا۔ اسی حالت میں انہوں نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا جس میں پوری کائنات کا پیار بھرا تھا۔

اس کے بعد میرے والد نے دادا کی قبر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولے، بیٹا اِس واقعے کے چوتھے دن ہی تیرے دادا کی چار پائی اُٹھ کر اِس قبرستان میں آ گئی۔ یاد رکھنا اس قبر میں تیرے دادا کی چار پائی دفن نہیں ہوئی، ایک پوری تہذیب دفن ہو گئی ہے۔ پھر میرا بازو پکڑ کر قبر کے پہلو سے اُٹھے اور میرا سہارا لے کر چلنے لگے۔ چلتے ہوئے اُن کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اُسی لمحے مَیں نے محسوس کیا کہ میرے والد کے ساتھ بھی ایک تہذیب وابستہ ہے اور اب وہ بھی کافی بوڑھے ہو گئے ہیں۔

زیارت کا کمرہ

آغا نجف کی اچانک موت نے مہرالنسا خانم کو مفلوج کر کے رکھ دیا یعنی جو دس ہزار کا مشاہرہ حویلی سے آتا تھا۔ اب اس کی کوئی صورت نہ تھی۔ اُدھر لاکھ سمجھانے پر بھی مہرالنسا کی بڑی بیٹی شرف النسا کسی دوسرے کی رکھیل بننے سے انکاری تھی اور خود وہ اس عمر میں دھندا کرنے سے رہی جب کہ چھوٹی ثمینہ کی عمر ابھی اس قابل نہیں تھی کہ اس کی نتھ کھلوائی جاتی۔ پھر اُس نے پچھلے دس سال سے کسی اور سے واسطہ بھی تو نہ رکھا کہ کوئی پرسش کو آتا۔ کہنے کو تو پینتیس سال سے اسی ہیرا منڈی میں اُس کا کوٹھا تھا مگر ایرے غیرے کو منہ لگاتا تو ایک طرف کسی دلال سے بھی تعلق نہ کیا۔ یہاں تک کہ مجلس، ماتم داری اور منت و وظائف کی تمام رسوم بجائے محلے کے امام باڑے کے، مرکزی امام بارگاہ ایوان حسین میں جا کر ادا کرتی۔ دراصل مہرو خانم کی نظر میں وہ تصویریں پھرتی تھیں، جب وہ اپنی ماں کے ساتھ فیض آباد سے یہاں آئی تھی اور شاہی محلے میں اُن کا کوٹھا گویا ایک دربار تھا، جہاں ایک سے بڑھ کر ایک، بیسیوں رنڈیاں اُن کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھیں۔ ہروقت رقص و آواز کا سامان اور آٹھ پہر رونقیں تھیں۔ اگرچہ فیض آباد کی طرح یہاں نواب نہ تھے مگر مہرو کی ماں خورشید آرا اب بھی اپنے ہاں کم نسب اور رذیل کو پھٹکنے نہ دیتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کے ہاں آنے والا نواب نہ سہی، کم سے کم شرفا میں تو ہو۔ خورشید آرا کے مرنے کے بعد تو ایسی منحوس ہوا چلی کہ محلہ صرف لُچے لفنگوں کا اڈا بن کے رہ گیا۔ حکومت نے ایسے قانون بنائے کہ شرفا نے آنا بند کر دیا۔ البتہ آغا نجف، کہ پرانے ملنے والوں میں تھا، جو ایک طرح سے مہرو خانم کا داماد بھی تھا، اُس نے آخری دم تک ساتھ نبھایا۔ وہ خود تو نہ آتا مگر دس ہزار ماہانہ بھیجتا رہا۔ اب جب کہ آغا نجف کا سہارا بھی نہ رہا تو اُس کی نشانی خادم حسین کی کفالت کی فکر

دامن گیر ہوئی۔ چھ مہینے تو اسی حالت میں گزرے لیکن کب تک؟ جب جمع شدہ سرمایہ آخری سانسیں لینے لگا تو مہرو خانم نے کوٹھے کے باہر پان سگریٹ کا کھوکھا لگا لیا اور کتھا چونا بیچنے لگی۔ چند دنوں میں کھوکھا چل نکلا اور دن میں دو چار سو آنے لگے، یوں یہ فکر تو کسی حد تک کم ہوئی مگر وہ خادم حسین کے حال سے تشویش میں گھلنے لگی، جو ابھی تین ہی سال کا تھا۔ اُسے ثمینہ کی تو ایسی فکر نہ تھی کہ وقت آنے پر جیسے وہ نقش نین بنا رہی تھی، سو آدمی اُس کے لئے تیار ہو جاتے لیکن وہ سمجھتی تھی کہ خادم حسین نواب کا لڑکا ہے، اِسے محلے میں نہیں رہنا چاہئے۔ اسی شش و پنج میں ایک سال اور نکل گیا۔ ایک دن اُس نے خادم حسین کو بڑی بیٹی شرف النسا کی گود میں کھیلتے دیکھا تو اُس کا جی بھر آیا اور وہ یہ سوچ کر گھلنے لگی کہ ایسا چاند کا ٹکڑا محلے کے شہدوں اور لفنگوں میں کیونکر زندگی کاٹے گا۔ اُس نے شرف النسا سے کہا، جس قدر جلد ہو سکے، لڑکے کو رنڈیوں کی صحبت سے دور کر دو۔ مَیں نہیں چاہتی، یاقوت کالے پتھروں میں برباد ہو۔ آج چھوکرے کی عمر ہی کیا ہے۔ ہوش لینے سے پہلے محلے سے ہٹاؤ گی تو پلٹ کر نہ آئے گا۔

لیکن کہاں بھیجوں؟ یہاں تو دور دور تک کسی شریف زادے سے تعلق نہیں، آغا نجف زندہ ہوتے تو ضرور لے جاتے کہ خون کا کچھ تو خیال ہوتا ہے، شرف النسا نے فکرمندی سے جواب دیا۔ مگر یہاں محلے میں ضرور خراب ہوگا۔ شرف النساء کی ماں نے دوبارہ زور دے کر کہا ایک سے ایک بدمعاش رنڈی بیٹھی ہے، مَسیں بھیگنے سے پہلے لونڈے کو چاٹ لیں گی۔ دیکھو تو کیسے ہاتھ پاؤں نکال رہا ہے، پھر مَیں تو کسی طرح نہ چاہوں گی کہ لڑکا محلے کے رذیلوں میں اُٹھے بیٹھے۔

مگر کہاں بھیجوں؟ کوئی ٹھکانا بھی تو ہو۔ شرف النساء کتاتے ہوئے لہجے میں بولی۔

مَیں نے ایک جگہ سوچی ہے، مہر النسا نزدیک ہو کر کہنے لگی، سید صادق تقی ہے نا، مرکزی امام بارگاہ ایوانِ حسین کا متولی، لڑکے کو اُس کی کفالت میں دے دیتے ہیں، خرچہ چپکے سے بھیجتے رہیں گے۔ وہیں سے مکتب میں جائے اور وہیں رہے۔ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوگی۔ خود ہم بھی کم ہی واسطہ رکھیں گی۔ سیّد زادوں اور شریفوں میں رہے گا تو دنیا کی عزت اور دین کی دولت دونوں پائے گا۔

مگر اماں! شرف النسا بولنے لگی پھر گویا دل ہی دل میں اپنی ماں کی عقل کو داد دے کر چپ ہوگئی، پھر تردد سے بولی، مگر اماں سید صادق کیونکر ایک رنڈی کے بیٹے کو لے گا؟ اُس کے تو

جنوں میں بھی رنڈیوں سے واسطہ نہیں۔ ایسا فرشتہ سیرت اور شب بیدار کیسے ہمارے پاپ کا ذمہ اُٹھائے گا؟ پھر خادم ابھی چار ہی سال کا تو ہے۔ وہ تو اس کی ناک پونچھنے سے رہا۔

ٹو فکر نہ کر مہر النسا فیصلہ کن لہجے میں بولی' سید تقی سے بات نہیں کروں گی۔ ہماری تو جو قسمت میں لکھا تھا بھوگ لیا، پر میں لڑکے کو ذلیل نہ ہونے دوں گی، پھر اسی عمر میں یہ یہاں سے نکلے تو اچھا ہے۔

☆

گزشتہ سال اس کڑاکے کی سردی پڑی کہ ہر شے ٹھٹکو کے رہ گئی۔ مہرو خانم جو رات گئے تک کھو کھے پر بیٹھتی تھی، اسی سردی سے نمونیے میں گرفتار ہو گئی۔ لاکھ دوا دارو کئے مگر افاقہ نہ ہوا۔ اگرچہ ساٹھ سے اوپر نہ تھی مگر عمر کے اس حصے میں تھی، جہاں دواؤں کے ساتھ دعاؤں کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ قبول نہ ہوئیں اور مہرو خانم دس دن کے اندر ہی قضا ہو گئی۔ اس اچانک موت نے شرف النسا کو ہلا کے رکھ دیا مگر اُس نے چند ہی دنوں میں اپنے آپ کو بحال کیا اور کھو کھے کے کام کو سنبھال کر گھر چلانے کا بندوبست کر لیا۔ وہ خود کھو کھے پر بیٹھنے لگی اور گھر کی دیکھ بھال ثمینہ کے حوالے کر دی۔ کئی مہینے اسی طرح معاملہ چلتا رہا، اس کے ساتھ ساتھ ثمینہ کی دلچسپیاں بھی بڑھتی گئیں۔ مہرو خانم کو مرے ابھی سال نہ ہوا تھا کہ اُس نے پَر نکالنے شروع کر دیے۔ شرف النسا کے لاکھ سمجھانے پر بھی تانک جھانک سے نہ رُکی، بلکہ کچھ دنوں سے سرِعام رنڈیوں کی صحبت پکڑ لی۔ شرف النسا نے یہ حالت دیکھی تو فکر میں پڑی۔ فوراً کبیر دلال سے رابطہ کر کے سردار جہانگیر احمد کے ساتھ تین لاکھ کے عوض گانٹھ دی۔ سردار جہانگیر احمد ثمینہ کو اپنی زمینوں پر پتوکی لے گیا، جہاں اُس کے بے شمار باغات تھے۔ پہلے تین ماہ تک ثمینہ کو اپنا کوٹھا یاد آیا، لیکن جہانگیر کی ناز برداریوں سے وہ اس جگہ کی عادی ہو گئی پھر اُسے کچھ اور اُمید بھی بندھ گئی کہ شاید جہانگیر اُس سے شادی کر لے اور یہ ہو بھی جاتا کہ قسمت نے ایک اور پلٹا کھایا۔ انہیں دنوں جہانگیر احمد کی ماں کو خبر ہو گئی کہ لاڈلے میاں نے گھر سے بالا بالا رنڈی رکھی ہوئی ہے۔ وہ انہیں قدموں پتوکی پہنچی اور ثمینہ کو میڈھیوں سے پکڑ کر دروازے سے باہر کر دیا، جہانگیر نے اُف تک نہ کی حالانکہ ثمینہ کے پیٹ میں اُس کا چار ماہ کا بچہ ہو چکا تھا، جسے اُس نے شادی کی اُمید پر جننے کا سوچا تھا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ثمینہ بار بار جہانگیر احمد کا منہ دیکھتی رہی کہ شاید ماں کو کھری کھری سنا دے مگر جہانگیر تو بھیگی بلی بنا کھڑا

تھا۔ اپنی ماں کے آگے جیسے کل کا بچہ ہو۔ ثمینہ نے یہ حالت دیکھی تو دونوں کو کوسنے دینے لگی۔ اس نے ایسے چوبے مرد کہاں دیکھے تھے؟ بالآخر تین حرف بھیج کر کوٹھے پر آ گئی۔ ایک دو مہینے اُسے اُمید رہی کہ شاید جہانگیر رابطہ کرے، جب اُدھر سے کسی نے خبر نہ لی تو اس نے دھندا کرنے کی ٹھان لی مگر مصیبت یہ تھی کہ پیٹ کا بچہ اب چھ مہینے کا ہو چکا تھا لہٰذا مایوس ہو کر کھوکھے کے کام میں شرف النسا کا ہاتھ بٹانے لگی اور دن گزرتے گئے۔

لڑکا پیدا ہوا تو ثمینہ نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ اگرچہ رکھیل بنانے کو سینکڑوں تیار تھے لیکن اب وہ مستقل کسی کی ہو کے رہنے کو راضی نہ تھی، آلات رباب سے گرد جھاڑ کر ایک سلیقے سے دھندا شروع کر دیا۔ پھر تو چند ہی ماہ میں دُور دُور بات نکل گئی اور محلے میں ایک جان آ گئی۔

☆

ایسی عزاداری تو لوگوں نے اپنے ہوش میں دیکھی نہ تھی۔ خادم نے انتظامات کچھ ایسے ڈھب سے کئے کہ ہر آدمی واہ واہ کر کے رہ گیا۔ امام باڑے کی اندرونی دیواروں پر تمام طرف سیاہ پردے لٹکا کر اُن پر کربلا کی جنگ کے مناظر تصویر کیے گئے۔ زیارات کے کمرے کو مقدسات سے بھر کے اُن پر عطر و عنبر کا چھڑکاؤ کر دیا کہ زیارت کرنے والوں کی آنکھیں نور اور دل و دماغ خوشبوؤں سے بھر جائیں۔ عزاداروں کے لئے شامیانوں اور سبیلوں کا انتظام، ماتمیوں اور زنجیر زنوں کے لئے فرسٹ ایڈ سے لے کر مکمل میڈیکل سنٹر کا قیام اور چاک و چوبند حفاظتی دستے کی عمل داری، ہر کام میں ایک سلیقہ تھا۔ اس کے علاوہ پہلی دفعہ پولیس انتظامیہ سے مل کر مرکزی امام باڑے سے لے کر گول چوک تک کا تمام رستہ دو طرفہ زنجیروں سے باندھ دیا تا کہ جلوس اور ماتمیوں کو بیرونی رکاوٹ پیش نہ آئے اور وہ خطرے سے دُور رہیں۔ اگرچہ آمدنی سابقہ سے زیادہ نہ تھی مگر حسنِ انتظام ایسا تھا کہ کسی کو شکایت کی گنجائش نہ ہوئی۔ اُنہیں پیسوں میں ملک کے نامور ذاکرین، سوز خواں اور نوحہ خواں بلوائے گئے۔ عوام الناس کے لئے دودھ کی سبیلوں کا اہتمام الگ تھا۔ خیر یہ سب تو ایک طرف، اس دفعہ لوگوں نے بھی وہ جوش و خروش دکھایا گویا پورا شہر اثنا عشری ہو گیا ہو۔ عزاداروں کا ایسا جمِ غفیر پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ شب عاشورہ کو ہزاروں نے شب بیداری میں حصہ لیا اور دسویں کو زنجیر زنی اور کوکلوں پہ ماتم تو ایسا ہوا کہ کسی نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ جس شخص نے پہلے کبھی بغلوں سے ہاتھ نہ نکالے تھے، اب وہ بھی سینہ کوبی کرتے نظر

آئے۔ سوز خوانوں کی ٹولیاں ایک کے بعد ایک جلوس میں اُترتیں اور اپنی آواز اور نوحے سے شہر بھر کو رلاتیں۔ ہر ایک کا خیال تھا، یہ سب اسی وجہ سے ہوا کہ انتظام اب کے خادم کے ہاتھ میں تھا۔

یوں تو ہر شخص سید صادق کی وفات کے بعد خادم سے مشورے کے بغیر امام باڑے یا عزاداری کے متعلق کوئی کام نہ کرتا تھا مگر یہ اہمیت اعجاز رضوی کی شہادت پر اور بڑھ گئی۔ جب خادم نے اپنی جان پر کھیل کر قاتلوں کا پیچھا کیا اور ایک کو مار گرایا۔ اس عمل میں اس کی اپنی ٹانگ بھی زخمی ہوگئی، جس کی وجہ سے مہینہ بھر ہسپتال میں رہا۔ اس دوران کوئی فرد ایسا نہیں تھا جو خادم کے لئے فکرمند نہ ہوا ہو۔ سادات وغیر سادات، سب نے اس کی صحت یابی کے لئے دعا کی اور تیمارداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ صحت مند ہو کر آیا تو ہر ایک کو بے پناہ خوشی ہوئی اور اس صلے میں کوثر شاہ نے عزاداری کے انتظامات اُسے سونپ دیے۔ جس کا نتیجہ توقع سے زیادہ اچھا نکلا۔ ذاکر جیسے ہی مصائب کی طرف پلٹتا، سب سے پہلے اسی کا بین اُٹھتا اور اس قدر روتا کہ امام باڑے کے در و دیوار لرز لرز اُٹھتے۔ ہر نماز کے وقت رائفل لے کر دروازے پر بیٹھ جاتا اور جب تک ایک بھی فرد نماز میں ہوتا، محافظت نہ چھوڑتا۔ امام باڑے سے ملحقہ کمرہ اُس کے جینے مرنے کا سامان تھا۔ چونکہ ہوش اسی کمرے میں سنبھالے تھے لہٰذا ایک قسم کا وہ اُس کا اپنا گھر تھا اور کبھی یہ گمان بھی نہ رہا کہ یہ جگہ امام باڑے کی ہے۔ کمیٹی نے خادم حسین کا ماہانہ آٹھ ہزار مشاہرہ مقرر کر دیا، جو اس سے پہلے سید صادق تقی کو ملتا تھا۔ دوسرا کام کمیٹی نے یہ کیا کہ وہ خادم کی شادی کے بارے میں بھی صلاح مشورے کرنے لگے، جب اس کی خبر شرف النسا کو ہوئی تو وہ سجدے میں گر پڑی۔ خادم حسین کو اگرچہ معلوم تھا کہ اُس کا سلسلہ ہیرامنڈی سے ہے مگر اُس نے کبھی شرف النسا کے ساتھ اس طرح کی بات نہ کی تھی اور نہ ہی شرف النسا نے اس موضوع کو کبھی چھیڑا۔ ماں بیٹے کے درمیان گویا ایک خاموش سمجھوتا تھا۔ ہر ماہ اپنی ماں کو اُن آٹھ میں سے چار ہزار باقاعدگی سے دیتا تھا۔ خادم اپنی خالہ ثمینہ کی عزت بھی ویسے ہی کرتا جیسے شرف النسا خانم کی کرتا۔ اُسے اُن کے دھندوں سے کوئی غرض نہ تھی۔ ہر طرف سے بے نیاز ایک ہی دُھن تھی کہ امامِ مظلوم کی عزاداری اب کے کیسے زور شور سے کی جائے۔ وہ ہمیشہ اُنہیں ذرائع پر غور کرتا، جو عزاداری سے متعلق ہوتے۔ خاص کر ذوالجناح کو سجانے اور زیور سے آراستہ کرنے میں تو ایسا جگر کو خون کرتا کہ عزاداروں کو بھی رشک آنے لگا تھا۔ اُس نے اپنی تنخواہ کا ایک حصہ ذوالجناح کے زیورات کے لئے مخصوص کیا تھا۔ عشرے کے روز

ذوالجناح کی باگ پکڑ کر چلنے کی اُسے بہت حسرت تھی لیکن یہ کسی سید کا کام ہوتا تھا، پھر بھی ہر حالت میں ذوالجناح کے ساتھ ساتھ چلتا۔ الغرض خادم کے بارے میں یہ طے تھا کہ اُسے سوائے عزاداری کے کسی سے کچھ غرض نہیں تھی۔

☆

نعمان سے اُس کا تعلق پچھلے سولہ سال سے تھا۔ جب اُس کی خالہ امام بارگاہ کی زیارت کرنے آتی تو وہ اُس کی گود میں ہوتا۔ علَم کو بوسہ دیتے وقت گود سے اُتارتی تو سیدھا خادم کی طرف بھاگا چلا آتا، پھر خادم گھنٹوں اُسے کھیلاتا، کھلاتا اور چہلیں کرتا۔ نعمان کے خط وخال ایسے تھے کہ کوئی بھی دیکھ کر پیار کیے بنا نہ رہتا۔ تیکھے تیکھے نقوش ماں کی عین چغلی کھاتے۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ رنڈی کا بچہ ہے۔ لڑکپن میں داخل ہوا تو دن میں ایک مرتبہ ضرور امام باڑے کا چکر لگاتا اور خادم کے پاس گھنٹوں وقت گزارتا۔ امام باڑہ اس کے سکول کے رستے میں پڑتا تھا۔ آتے جاتے امام بارگاہ دوسرا گھر ہوگیا۔ اب نعمان انتظامی معاملات میں خادم کا بہت کچھ ہاتھ بھی بٹانے لگا تھا، جس کا فائدہ تو بہر حال تمام کو یکساں تھا۔ علاوہ اِن باتوں کے، سادات اور دیگر شیعہ حضرات کے لڑکے جو نعمان کے ہم عمر تھے، اُس کے اِس طرح سے دوست بن گئے کہ یہ بھی اُسی طبقے کا حصہ بن گیا، جس کا پچیس سال پہلے خادم بنا تھا اور کسی کو خیال بھی نہ رہا کہ نعمان کی ماں دھندا کرنے والی ہے۔ البتہ نعمان میں ایک بات خادم سے الگ تھی، وہ لڑکیوں کے ساتھ کھلنے ملنے کی کوشش ضرور کرتا۔ حتیٰ کہ ایامِ عزا میں بھی اِدھر اُدھر تاکنے سے باز نہ آتا۔ جس کی وجہ سے خادم نے اُسے بہت دفعہ ڈانٹا۔ وہ اس کی اِن حرکات سے خوف زدہ تھا مگر نعمان کے اندر کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ظاہر کئے بغیر نہ رہتا۔ اب میٹرک کے بعد نعمان کی ماں نے اُسے کالج میں داخل کرایا تو اس نے یہ گُل کھلایا۔

اصل میں نزہت سے اس کی عشق بازی تو پچھلے چھ ماہ سے جاری تھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ لڑکا تھا بھی طرح دار، کسی بھی لڑکی کا گرفتار ہو جانا دور نہیں تھا۔ وہ کتابیں بغل میں دابے جیسے ہی ہیرا منڈی سے کالج کے لئے نکلتا اور ٹھنڈی سڑک پر آتا تو دونوں کا آمنا سامنا ہو جاتا۔ اوّل اشارے ہوئے، پھر رقعے پھینکے گئے اور اب بات ملاقاتوں تک آ گئی تھی لیکن دوسری طرف زمانہ سویا تھوڑا ہی تھا۔ ارد گرد سے ہل چل ہونے لگی۔ آوارہ اور تلنگوں نے کان کھڑے کر لئے اور

جب تحقیق سے بات کھلی کہ لڑکا کنجروں کا ہے تو اور بھی بھونچال آ گیا۔ عزت نے پے در پے جوش کھائے۔ نعوذ باللہ، لاحول ولا کے آوازے بلند ہوئے۔ شرفا نے توبہ توبہ کی اور اس عذاب کو روکنے کے منصوبے ہونے لگے۔ نوجوان مرکزی اصلاحی کمیٹی کے سیکرٹری و ضلعی ناظم اسلامی جماعت جنرل عبدالصمد کے ہاں پہنچے اور معاملہ زیرِ بحث آ گیا۔

ایک: بھائی عبدالصمد غضب ہو گیا۔

دوسرا: جی اب کے بھی اللہ عذاب نہ بھیجے تو پھر پتا نہیں کیا راز ہے؟

تیسرا: راز کیا ہوتا ہے، اللہ ہماری غیرت کو آزما رہا ہے۔

چوتھا: دیکھو تو سہی، حرام زادہ ایک تو کنجر ہے اور اوپر سے شیعہ بھی، رفیق بھائی! میں نے اُسے ہمیشہ امام باڑے میں دیکھا ہے۔

تیسرا: دیکھا ہے سے کیا مطلب؟ پورا کافر شیعہ ہے اور کنجر تو وہ ہے ہی۔

پہلا: اور اس نزہت بے غیرت کو دیکھو۔ اس کو یہی حرامی عشق لڑانے کو ملا تھا۔ اللہ قسم، پورے شہر میں سنّی مسلمانوں کی ناک کٹوا دی، میرا بس چلے تو تیزاب میں غوطے دوں۔

عبدالصمد: بھائیو! یہ عورت ذات کی کوئی غیرت ویرت نہیں ہوتی، کہیں بھی پھسل گئی، پھسل گئی۔ غیرت تو مردوں کا خاصا ہے اور وہ اللہ کے فضل سے ہم میں ہے۔ جبھی تو اس کا سدِّ باب کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔

دوسرا: یہاں سنّی لڑکے ایک سے ایک پڑا ہے۔ کمینی کو یہ کنجر اور شیعہ ملا تھا؟

عبدالصمد: دیکھو بیٹا! اب ان باتوں کو جانے دو اور کوئی اقدام کرو۔ میرا خیال ہے لڑکی کے والد کو خبردار کرتے ہیں اور اُسے بلا کر تنبیہ کرتے ہیں کہ اِسے کالج سے اُٹھوا لو۔ اول تو عورت کو کالج کی تعلیم ضروری نہیں، قرآن ہی کافی ہے، اتنا ہی ضروری ہے تو گھر میں ٹیوشن رکھوا لے۔

چوتھا: اس کا کوئی فائدہ نہیں، وہ بھی بے غیرت ہے، دوسری بات یہ کہ اُس کنجر کو سزا بھی تو دینی ہے۔ پتا نہیں، اب تک عیاشی کر چکا ہے۔

عبدالصمد: دیکھو بیٹا! ہم مسلمانوں میں یہ خرابی بہت زیادہ ہے کہ جذباتی ہو کر قدم اُٹھاتے ہیں اور بالکل صحیح قدم غلط طریقے اور غلط وقت پر اُٹھاتے ہیں، جس کی وجہ سے شیعہ کافر رو دھو کر دنیا کو مسلمانوں کے خلاف اپنا ہمدرد بنا لیتے ہیں۔ یہ مسئلہ غیرت سے زیادہ دینی ہے، اب

یہاں صرف نزہت ہی نہیں، سنی مسلمانوں کی عزت اور آبرو کا سوال بھی پیدا ہو چکا ہے، اس لیے ہم یہ لڑائی دو محاذوں پر لڑیں گے، ایک پر تم سب اور دوسری پر میں۔ پہلی لڑائی تم لڑو گے اور دوسری میں لڑوں گا۔

پھر عبدالصمد نے سب کو ہر بات تفصیل سے سمجھا کر رخصت کر دیا اور خود اہلسنت کے مرکزی صدر مولانا عبدالباری کی طرف چل دیا۔ دوسرے دن سب نے اپنے اپنے کام کو ذہن میں رکھا اور صبح ہی چمن زار چوک پر اکٹھے ہو گئے۔

......

دیکھ انعام، آج یہ بچ کے نہ نکلے، تو شریف کو اپنے ساتھ لے کر بوائز کالج کے گیٹ نمبر دو پر کھڑا ہو جا۔ ہمایوں، صابر کے ساتھ ٹھنڈی سڑک والی کنٹین پر رستہ داب لے۔ میں اور نوید یہیں آموں کے نیچے تھڑا لگاتے ہیں۔ بس یہ تین ہی راستے تو ہیں کنجر کے بھاگ نکلنے کے ہیں، رفیق تالیے نے ساتھیوں کو ہدایات دے کر کمر سے ہنٹر کھول لیا اور اُسے گھمانے لگا۔

رفیق تالیے کی ہدایات پر انتہائی پھرتی سے عمل کیا گیا اور سب اپنے اپنے ہنٹر بیلٹ اور چاقو نکال کر تیز آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ دوسری طرف نعمان اس تمام منصوبہ بندی سے بے خبر کمپنی باغ میں برگد تلے انتظار کاٹ رہا تھا۔ آج اس کی نزہت کے ساتھ تیسری ملاقات تھی۔ نزہت کے ان دنوں پیپرز ہو رہے تھے، اُس نے ساڑھے بارہ بجے پیپر سے فراغت کے بعد کمپنی باغ میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ تھوڑی دیر نزہت کے رومال کو سونگھنے اور چومنے کے بعد اُس نے پینٹ کی جیب میں ڈال لیا اور ناخن کٹر نکال کر برگد کے تنے پر حروف کھودنے لگا۔ لمحہ لمحہ بعد اُس کی نگاہیں کمپنی باغ کے مشرقی گیٹ کی طرف اُٹھ جاتیں۔ بے دھیانی میں کٹر کی نوک انگلی میں چبھ گئی اور وہ ایک سی کی آواز نکال کر رہ گیا۔ اسی لمحے اُس نے نیلا پیرہن گیٹ کے اندر داخل ہوتے دیکھا تو انگلی کا درد بھول گیا۔ پھر تھوڑے ہی وقت میں دونوں آم کے پیڑ تلے باہم ہو گئے اور رومان کی لے چلنے لگی۔ چہار جانب سے بے خبر اسی سرور کے مزے لے رہے تھے کہ بلوہ ہو گیا اور ایک زور کا ہنٹر نعمان کی دائیں پسلی پر لگا۔ اُسے ایک دم گویا بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ رفیق تالیے نے نزہت کا بازو پکڑ کر ایک طرف کھینچ لیا۔ نعمان نے آٹھ سات غنڈوں کو یوں چھری کانٹے سے لیس دیکھا تو چکرا گیا۔ اُس نے ایسی بلائیں پہلے کہاں دیکھی تھیں مگر جلد ہی سنبھلا اور اچانک دائیں

جانب کے مشرقی گیٹ کی طرف سرپٹ بھاگ اُٹھا۔ لڑکوں کو اُس سے ایسی توقع نہ تھی۔ آپادھاپی میں سب پیچھے لپکے اور پکڑو بھاگو کا شور بلند ہونے لگا۔ دوپہر ایک بجے کا عالم تھا اور کمپنی باغ میں آگے پیچھے دوڑیں تھیں۔ اردگرد کے لوگ تماشے کو رک رک پڑے، مگر نعمان یہ جا وہ جا، گیٹ پار کر کے جنوبی سمت سے ٹھنڈی سڑک کو کاٹتا ہوا عطر والوں کی گلی میں جانکلا۔ وہ بھی کب پیچھا چھوڑنے والے تھے، برابر چڑھتے گئے۔ ادھر نعمان نے غوطہ کھایا کہ سیدھا کرچن روڈ سے ہوتا ہوا سید باقر شاہ کے مکان کو اُلٹے ہاتھ رکھ کر بھاگا اور امام بارگاہ کی گلی میں آ گیا۔ لڑکے چاقوؤں سمیت پیچھے تھے اور خدا جانے رستے میں کیسے کیسے نعرے لگاتے آئے کہ امام باڑے تک آتے آتے پیچھا کرنے والے پچاسوں میں ہو گئے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھا امام باڑے میں آ پناہ لی۔ خادم دروازے پر بیٹھا ظہرین ادا کرنے والے نمازیوں کا پہرہ دے رہا تھا، فوراً معاملے کو بھانپ گیا اور دروازے پر مزید مستعد ہو گیا۔ اُن میں سے کسی نے اندر آنے کی جرات تو نہ کی البتہ نعرے لگانے شروع کر دیے اور نعروں میں ایسے ایسے لفظ بولنے لگے کہ معاملہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ خادم نے بڑھتے ہوئے شور اور ہجوم کو دیکھا تو دروازہ بند کر دیا اور نعمان کو زیارات کے کمرے میں بند کر کے تالا لگا دیا۔ دروازے کے باہر نعروں اور ہجوم کا مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ نمازیوں کو اصل صورت حال کا توفی الوقت ادراک نہ ہوا البتہ بڑھتے ہوئے شور اور ہنگامے سے بوکھلا گئے اور جلدی جلدی نماز سے فارغ ہو کر حقیقت کا پتہ لگانے لگے۔ کچھ ہی دیر میں پولیس آ گئی جب کہ مجمع سینکڑوں میں جمع ہو کر خدا جانے کیا کیا نعرے لگا رہا تھا، جس کی نمائندگی مولانا عبدالباری اور عبدالصمد کر رہے تھے۔ معاملہ انتہائی نازک صورت حال اختیار کرتا جا رہا تھا، جس کی وجہ سے شیعہ سنی فساد کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ پولیس نے یہ صورت دیکھی تو فی الفور طاقت اور آنسو گیس کا استعمال کر کے مجمعے کو ایک گھنٹے میں منتشر کر دیا اور معاملے پر کنٹرول حاصل کر کے اصل صورت کا جائزہ لینے لگے۔ تین گھنٹے کی مسلسل کوششوں کے بعد ساری بات کھل کر سامنے آ گئی۔ سُنی علما اور عوام کا کہنا تھا کہ نعمان کنجر ایک شریف گھرانے کی لڑکی کو کالج آتے جاتے تنگ کرتا ہے اور بیہودہ مذاق کر کے اُسے دق کرتا تھا، اس کے علاوہ صحابہ کی شان میں بُرا بھلا کہنے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ آج سرِ عام اُس کے ساتھ زبردستی کرنے پر تلا ہوا تھا کہ اسی لمحے چند لوگ پہنچ گئے، وہ جب نعمان کو پکڑنے لگے تو صحابہ کو گالیاں دیتے ہوئے بھاگ اُٹھا اور آ کر امام باڑے میں پناہ لے لی

اور خادم نے اسے کمرہ زیارات میں چھپا دیا۔ نعمان اِن الزامات سے انکاری تھا لیکن معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے اُس سے توبہ کروائی گئی۔ شام تک ایس پی صاحب نے سرکردہ شیعہ سنی افراد پر مشتمل ایک امن کمیٹی قائم کی اور عشا کے قریب غیر مشروط طور پر معاملے کو رفع دفع کروا کے ایک دوسرے کے گلے ملوا دیا، اس طرح یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا اور بات آگے بڑھنے سے رُک گئی۔

مگر دوسرے ہی دن ایک اور کمیٹی تشکیل دی گئی لیکن یہ کمیٹی صرف اور صرف معزز شیعہ افراد پر مشتمل تھی، جسے ہنگامی طور پر کوثر شاہ نے قائم کیا تا کہ اس بدنامی کا سد باب کیا جا سکے۔ کمیٹی کا اجلاس امام باڑے سے ملحقہ مین اُسی کمرے میں ہوا، جو امام باڑے کے متولیوں کے رہنے کے لئے مخصوص تھا۔ سید تقی کے بعد جس میں اب خادم حسین رہتا تھا۔ اجلاس میں موجود تمام افراد کا تعلق عمر کے اس حصے سے تھا، جہاں جذبات کا گزر نہیں ہوتا۔ کسی بھی نوجوان کو شامل نہ کیا گیا تا کہ کسی قسم کی اشتعال انگیزی نہ ہو۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر سید نذیر حسین نے سکوت توڑا اور کوثر شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، شاہ جی سانس تو پہلے ہی اوکھی میں چلتی ہے، اب یہ نیا قصہ ہماری ساکھ کو جو دھکا دے گیا ہے، اس کی کوئی تلافی نہیں۔ سارے شہر میں امام باڑا بدنام ہو گیا۔

مرزا صاحب بولے: مَیں نے تو پہلے ہی کئی دفعہ کہا تھا اِن کنجروں سے رابطہ نہ رکھو لیکن یہاں تو ہر آدمی بقراط بنتا ہے اور ہر چھوٹا بڑا انسانیت کے نغمے گانے لگتا ہے۔

سید شمس الحسن: مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ اس چھوکرے کو ایسا کرتب کر کے امام باڑے میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اپنا رنڈی خانہ دُور تھا، اُدھر بھاگ جاتا۔ اب ہر ایک یہی بھونکے گا کہ امام باڑہ تو اصل میں لفنگوں کا اڈا ہے اور یہاں کنجر پناہ لیتے ہیں۔

سید نذیر حسین: مجھے تو پہلے دن سے ہی اس لونڈے کے اطوار ٹھیک نہیں لگتے تھے، اگر سچ پوچھو تو اس پورے قضیے کا ذمہ دار نعمان نہیں خادم ہے، جو اول روز سے اسے چھوٹ دیتا رہا اور دن رات امام باڑے کو اس کا گھر بنا دیا۔

علی رضا نے خادم پر الزام آتے دیکھا تو کہا: اس طرح تو پہلا قصوروار سید صادق تقی تھا، جس نے خادم کو جگہ دی، خادم کی زندگی کا مَیں گواہ ہوں، آج تک اُس میں ایسا عیب میری نظر سے نہیں گزرا۔

سید شمس الحسن: میاں علی آپ تو ہمیشہ الٹی ہانکتے ہیں، اب یہاں سید تقی کہاں سے آ گیا۔
کیا اس کا یہ گناہ تھا کہ اس نے ایک رنڈی کے بیٹے کو انسان بنانے کی کوشش کی۔

سید علی حسین: شاہ صاحب، انسان پھر انسان ہے، غلطی ہر ایک سے ہو جاتی ہے۔ اس کی سابقہ خدمات کو بھی نظر میں رکھو۔ اس معاملے میں خادم کا کیا قصور ہے؟ بچارہ بیس سال سے سب کی خدمت میں مصروف رہا۔

سید نذیر حسین: میاں تم بیٹھے رہو۔ تمہیں نہیں پتا؟ یہ اسی کا خالہ زاد ہے۔ کنجروں کی حمایت پہلے دن سے ہی تمہاری سرشت میں ہے۔ اگر خادم اسے پناہ نہ دیتا تو کیا یہ بدنامی ہوتی؟ پھر غضب یہ کیا کہ کمرہ مزیارات میں چھپا دیا، لاحول ولا یعنی پاک جگہ پر نطفہ حرام کو بند کر دیا۔ رہی خدمت کی بات؟ تو ہم پر کیا احسان کیا؟ مولا حسین کی عزاداری کی ہے۔

اس اچانک یاددہانی پر کہ 'نعمان کو دراصل کمرہ مزیارات میں چھپایا گیا' نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ایک دم سناٹا چھا گیا، سب کے چہرے سرخ ہو گئے اور غصے سے کانپنے لگے۔ بعضوں کے چہروں پر سیاہی پھیل گئی گویا کسی عذاب کی نوید سنا دی ہو۔ کچھ دل ہی دل میں استغفار پڑھنے لگے اور مدافعت میں بولنے والی تمام زبانیں گنگ ہو گئیں۔

یعنی نعمان کو متبرکات کے درمیان چھپا دیا؟ حرامزادے کو؟ تم سب پر غازی پاک کا غضب نازل ہو۔ ابھی تک تم اسی فکر میں ہو کہ اب کرنا کیا ہے؟ آغا فیروز الحسن غصے سے کانپنے لگا۔ اس حرافہ کے بچے کی تو بوٹیاں نوچ دینی چاہئیں۔ بس نکالو ابھی نکالو ان دونوں کو۔ اب میں ان کو ایک آنکھ نہیں دیکھنا چاہتا۔

سید کوثر شاہ، جو بڑی دیر سے خموش بیٹھا تھا، تحمل سے پہلو بدل کے بولا، دیکھو بھائی، قصہ تو یہ ہے کہ یہ ایک بڑا نامناسب کام ہوا ہے اور پورے شہر میں شیعہ کی بدنامی ہوئی ہے، جس میں میرا خیال ہے خادم اور نعمان برابر کے ذمہ دار ہیں یعنی غلطی تو ہر ایک سے ہو جاتی ہے مگر اس طرح امام باڑے کی عزت کو داؤ پر لگانا واقعی ہی گھناؤنا جرم ہے، لہٰذا اب آپ کوئی حتمی رائے دے کر فیصلہ کر دیں تاکہ آئندہ کے لئے کوئی سدباب ہو سکے۔

حاجی نذیر حسین: میری تو ایک رائے ہے، کوے کو دودھ سے سو سال نہلاؤ وہ کالا ہی رہے گا اس لئے اپنی عزت بچاؤ۔

اس طرح چار گھنٹے کے مسلسل صلاح مشورے سے کمیٹی نے ایک فیصلہ کر دیا۔ جس پر تمام شیعہ معززین اور شرفا کے دستخط ثبت ہو گئے اور اسی وقت خادم حسین کو بلا کر فیصلہ سنا دیا گیا۔ اُسے بتایا گیا کہ آئندہ اُسے مرکزی امام باڑے میں رہنے اور سادات و شرفا سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں۔ واپس اپنی ماں کے کوٹھے پر چلا جائے۔

خادم حسین چابیاں کوثر شاہ کے حوالے کر کے امام باڑے سے نکلا تو اُسے لگا، جیسے اُس پر عذاب نازل ہو چکا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ہیرا منڈی کی طرف بڑھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا، وہاں کے امام باڑے کا متولی کتنا خوش قسمت ہے، جسے کوئی نکالنے والا نہیں۔ شرف النسا کے کوٹھے پر پہنچا تو تھوڑی دیر خالی الذہن کھڑا رہا، پھر بھاری قدموں سے کوٹھے میں داخل ہو گیا۔ بوڑھی شرف النسا نے اُسے اپنی بانہوں میں لے لیا، جیسے تیتری بچے کو پروں میں چھپا لے۔ خادم نے شرف النسا کی گود میں سر رکھ دیا اور ہچکیاں لے کر رونے لگا۔

نسلیں

یہ آدمی کچھ ہی دن پہلے اس پارک میں آیا تھا۔ پھٹی پرانی شرٹ کے ساتھ میلا چکٹ پاجامہ اور پاجامے کو کپڑے کی ایک دھجی سے باندھا ہوا تھا۔ داڑھی اور سر کے بال جھاڑ جھنکاڑ تھے۔ اس کے پاس ایک بوری نما بڑا سا تھیلا تھا۔ میں یہ تو نہیں جانتا، تھیلے میں کیا تھا مگر یہ وہ تھیلا نہیں تھا، جو کچرا چننے والے اُٹھائے پھرتے ہیں۔ ایسے تھیلے پاگلوں کے پاس ہوتے ہیں کہ اُنھیں راہ میں جو شے پڑی ملے، اُٹھا کر تھیلے میں ٹھونس لیتے ہیں۔

اُن دنوں میں ایف ایٹ سیکٹر میں ایک دوست کے ساتھ رہتا تھا اور شدید سردی کے دن تھے۔ رہائش سے چند قدم کے فاصلے پر ہی یہ پارک تھی۔ میں وہاں چہل قدمی کے لیے نہیں جاتا تھا۔ مجھے اُن سرکاری افسروں اور کلرکوں سے ہمیشہ چڑ رہی ہے، جو اپنی موٹی تازی بیویوں کے ساتھ صبح شام بدہیئت پیٹوں کی چربی پگھلانے چلے آتے ہیں اور پارکوں کی ستھری ہوا کو بدبودار بنا کر دفتروں میں جا بیٹھتے ہیں۔ اُن سے دور رہنے کے لیے میں رات آٹھ بجے کے بعد نکلتا اور اُن جگہوں پر چہل قدمی کرتا، جو ایسے لوگوں سے خالی ہوتی ہیں لیکن پچھلے چھ سات دن بخار میں رہنے کے سبب کمزوری ہو گئی تھی، اس لیے دُور جانے کی بجائے اسی پارک میں آ جاتا۔ یہ شخص اکثر وہیں پایا جاتا مگر حیرت کی بات یہ کہ کسی کے پاس نہ جاتا، لوگوں سے دُور دُور بیٹھتا اور ذرا فاصلے پر رہتا۔ میں اُس کے نزدیک جاتا تو فوراً آگے بڑھ جاتا۔ اس کے پاوں میں کوئی جوتا نہیں تھا، نہ میرا خیال ہے، کبھی اُس نے اس کی پروا کی ہوگی۔ ایک دفعہ میں قریب کی مارکیٹ میں گیا تو وہاں ایک ہوٹل کے باہر اپنا تھیلا چوتڑوں کے نیچے رکھ کر بیٹھا روٹی کا ٹکڑا کھا رہا تھا، مگر جیسے ہی میں پہنچا، اُٹھ کر چل دیا۔ مجھے اُس کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا، گویا میں اس کے چیتھڑوں کا غلیظ تھیلا اُٹھا کر

بھاگ جاؤں گا۔ اب مجھے ضد ہو گئی کہ ہر حالت میں اسے پکڑوں گا۔ یہ سوچ کر بے دھڑک اُس کے پیچھے لگ گیا اور پارک کی دوسری نکڑ پر جا لیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا، کچھ لوگ پارک میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ بچے اِدھر اُدھر جھولوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ تھیلا اُٹھا کر پھر بھاگتا، میں فوراً اُس پر بیٹھ گیا۔ میرے اس عمل پر اُسے ایک جھٹکا سا لگا اور دیدے پھاڑ کر دیکھنے لگا، جیسے ڈرا ہوا ہو۔ مَیں نے خیال کیا، اس کے دل میں کوئی چور یا راز ہے، عام آدمی کو اس طرح ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں نے پوچھا۔

میرے سوال کو اُس نے گویا سنا ہی نہیں تھا اور تک تک مجھے دیکھتا رہا۔ کچھ لمحے خموشی کے بعد میں نے پھر پوچھا، کیا نام ہے تمھارا؟ بتاتے کیوں نہیں؟ وہ پھر بھی نہیں بولا اور میرے نیچے سے تھیلا کھینچنے لگا لیکن اس بار میں ضد پر آیا ہوا تھا، اُس کا ہاتھ پرے جھٹک کر تھیلے پر مزید وزن ڈال دیا اور کرخت لہجے سے پوچھا، بتاتے کیوں نہیں، کون ہو؟ اس تھیلے میں کیا ہے؟ نہیں بتاؤ گے تو میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ اب وہ گھبرا گیا اور بولا، میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

یہاں کیا کر رہے ہو؟

میرے اس سوال پر وہ پھر چپ رہا اور ڈرے ڈرے دیکھنے لگا۔ اِتنے میں دو تین بچے کھیلتے ہوئے قریب آ گئے اور ہماری طرف بھاگنے لگے۔ ایک تو اُس آدمی کی حالت پاگلوں کی سی تھی، اُس پر میرا اپنا حلیہ بھی جسمانی کمزوری کے سبب، اُسی جیسا لگ رہا تھا۔ مَیں نے سوچا، بچے ہم دونوں کو ایک ہی طبقے سے نہ سمجھ لیں اس لیے فوراً وہاں سے اُٹھا اور دوسری طرف چل دیا۔ میرے اُٹھنے سے اُس کے چہرے پر سکون آ گیا۔ وہ چند لمحے وہیں بیٹھا رہا۔ مَیں جاتے ہوئے کن اَکھیوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ جب مَیں اُس سے کافی دور ہو گیا تو اُس نے جلدی سے تھیلا اُٹھایا اور پارک سے باہر کی طرف چل دیا۔ پھر یہ شخص مجھے یہاں نظر نہیں آیا۔ آٹھ دس روز گزر گئے، ایک دن شام کو کسی کا فون آیا کہ آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ مَیں نے پوچھا، آپ کون ہیں اور کیوں ملنا چاہتے ہیں؟ اُس نے بتایا، میرا نام قیوم ہے، آپ کے کچھ افسانے پڑھے ہیں، اچھے لگے ہیں، اس لیے چاہتا ہوں، آپ سے مل بھی لوں۔ سُنا ہے، آپ اسلام آباد ہی میں رہتے ہیں، بُرا نہ لگے تو پتا اور وقت بتا دیں، مَیں آ جاتا ہوں۔ کہنے کو تو میں اسلام آباد میں رہ رہا تھا لیکن یہ بات

صرف مجھے ہی معلوم تھی کہ کس مصیبت میں گزر رہو رہی تھی۔ سراسر دوستوں کے سہارے پر تھا اور نہیں چاہتا تھا، اُن پر مزید بوجھ ڈالوں۔ مَیں نے جواب دیا، قیوم صاحب! آپ یہ دونوں چیزیں مجھے بتا دیں، مَیں خود آپ کی طرف آ جاتا ہوں۔ اُس نے کہا، تکلف نہ سمجھیں تو ای سیون میں مرے مکان پر آ جائیں۔

یہ جگہ ایف ایٹ تھری سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ مَیں شام کو پیدل ہی وہاں پہنچ گیا۔ جیسا کہ میری توقع تھی، اُس نے ادب اور میرے افسانوں پر سیر حاصل گفتگو کے ساتھ کافی تواضع کی۔ رات دس بجے تک وہیں بیٹھا رہا۔ اُٹھنے لگا تو گاڑی کے ذریعے چھوڑنے کا اصرار کیا لیکن مَیں نہیں مانا اور پیدل ہی چل پڑا، مجبور ہو کر وضعدارانہ تھوڑی دُور ساتھ چلا اور گلی کی نکڑ پر پہنچ کر رخصت لی۔ مَیں گرین بیلٹ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کہر بھی زیادہ نہیں تھی مگر سردی بہت کڑاکے کی تھی اور ہر طرف سناٹا تھا۔ مجھے یہ موسم بہت رومانوی سا لگا۔ مَیں کبھی چیڑ کے درختوں کے درمیان چلنے لگتا، جہاں سے چاند کی روشنی چھن چھن کر درختوں میں اُتر رہی تھی، کبھی فٹ پاتھ پر ہو لیتا۔ کچھ ہی فاصلے پر، جہاں ای ایٹ کے علاقے کے آغاز کے ساتھ ہی ائرفورس کے رہائشی مکان ہیں اور چنار کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، مَیں سڑک کو ایک طرف رکھ کر چناروں کے درمیان ہی چلنے لگا، کہ یہ منظر بہت ہی انمول تھا، ہر طرف زرد پتوں کا سونا بکھرا ہوا تھا۔ مَیں اِن چناروں کے درمیان تھوڑی دُور ہی چلا تھا کہ ایک ٹین کا بنا ہوا ویران سا کیبن کھڑا نظر آیا۔ اس طرح کے ٹوٹے پھوٹے کیبن اسلام آباد میں اکثر نظر آ جاتے ہیں، جو کبھی سیکورٹی کے لیے استعمال ہوتے رہے، سیکورٹی ہٹانے سے بیکار ہو جاتے ہیں اور اُنہیں اُٹھانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کیبن کا دروازہ اُکھڑ چکا تھا، چھت باقی تھی، وہ بھی شاید بارش میں ٹپکتی ہو۔ مَیں اُسے نظرانداز کر کے نکل جاتا مگر میرے غور کرنے پر لگا کہ کیبن کے اندر کوئی شخص بوسیدہ کمبل اور پھٹی پرانی چادریں اوڑھے لیٹا ہوا ہے اور خراٹے لے رہا ہے۔ مَیں کچھ لمحے کھڑا ہو کر اُسے دیکھنے لگا، اچانک میری نظر ایک بوری پر پڑ گئی، جو اگرچہ اُس نے سر کے نیچے رکھی تھی لیکن اب سر کے نیچے سے نکل کر ایک طرف لُوھک گئی تھی۔ یہ تو وہی شخص اور اُس کا تھیلا تھا۔ مَیں نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر آہستہ سے تھیلا اُٹھا لیا اور تھوڑی دُور جا کر اُسے اُلٹ دیا۔ اُس میں پُرانے چیتھڑے، ٹوٹے ہوئے جوتے، ایک بڑا سا موم کاغذ، جو شاید بارش سے بچنے کے لیے تھا۔ اِن کے علاوہ ایک کاغذوں کا پُلندہ اور بہت سی

کچی پکی پسلیاں تھیں۔ میں نے باقی چیزیں، تھیلے میں ٹھونس کر کاغذ بغل میں دابے اور مکان پر آ گیا۔ مجھے تجسس تھا، آخر دیکھوں تو اس میں لکھا کیا ہے؟ تسلی سے بستر میں لیٹ کر اُسے پڑھنا شروع کیا۔ عبارت نہایت اُلجھی اور خراب تھی لیکن میں پڑھنے میں ڈٹا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد تحریر سمجھ میں آنے لگی۔

میں اُس کو اتنا گندا اور منحوس بنا دوں گا کہ وہ بدبُو اور گندگی وہاں پڑھی گئی تمام دعاؤں کے ساتھ لپٹ کر خدا کے پاس جائے گی اور خدا اُن دعاؤں کو دور ہی سے رد کر دے گا اور اُنہیں اپنی بارگاہ میں داخل نہیں ہونے دے گا۔ خدا تو اُسے پہلے بھی پسند نہیں کرتا اور اُٹھا اُٹھا کے دھویں والی آگ میں پھینکتا ہے۔ یہ دھواں خبیث شے ہے، ناک، منہ، سینہ اور دل، ہر شے میں بھر جاتا ہے۔ ہمارے اپنے گھر میں بھی بھر گیا تھا، اور سارے مر گئے تھے۔ مگر یہ دھواں اللہ نے نہیں، اسی خبیث نے بھرا تھا۔ اب میری سب سے بڑی کوشش ہے کہ میں ایسا کام کر جاؤں کہ اللہ اس جگہ کو بھی کالے اور گاڑھے دھویں سے بھرتا رہے، جس کی وجہ سے اس کی سانس اُسی طرح بند ہو جیسے دوسروں کی ہوئی تھی، ہمارے سارے گھر کی ہوئی تھی۔ لیکن میں جانتا ہوں میری ماں کی طرح آدھے سے زیادہ لوگ پاگل ہیں، میری ماں بھی اس کے حق میں دعا کرتی تھی، وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ ہمارے خون کو ناپاک کر رہا ہے اور نسل ختم کر رہا ہے میں نے تہیہ کیا ہے، جب تک زندہ ہوں، یہ بدبو پھیلاتا رہوں گا۔

اسی طرح کی بہت سی واہی کاغذ پر جگہ جگہ درج تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، یہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ پتا نہیں کون سی بدبو تھی اور کس جگہ تھی؟، بار بار دھواں کہاں سے آ جاتا تھا اور یہ کالا اور گاڑھا دھواں کیا تھا؟ کس نے پھیلایا تھا؟ نہ کسی کا نام، نہ کوئی نشان۔ آگے چل کر بار بار ایک ہی تحریر کا اعادہ کیا گیا تھا۔

آج میں نے وہاں جی بھر کے گند پھینکا اور بہت زیادہ پھینکا۔ میرا جی خوش ہو گیا۔ میرا خیال ہے، میرا خدا بھی خوش ہو گا۔ اگر نہ بھی ہوا تو کوئی بات نہیں۔ وہ کون سا ہر ایک پر خوش رہتا ہے، مجھے تو ایسے لگتا ہے، خدا سب کے ساتھ ایک جیسا ہی سلوک کرتا ہے۔ اُسے اچھے بُرے کی پہچان ہی نہیں، اُس کے فرشتے رشوت لے کر بک چکے ہیں، رشوت تو ہر جگہ چلتی ہے۔ اسی لیے اچھے اعمال بُروں کے حصے میں آتے ہیں اور کالے عمل اچھوں کے پلڑے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اللہ کا ترازو بھی

ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ ہر چیز خراب ہو گئی ہے لیکن کوئی بات نہیں، مَیں بھی ہارنے والا نہیں۔ مجھے یقین ہے، اگر میں اس کام میں چھٹی نہ کروں تو ایک دن کامیاب ہو جاؤں گا۔ اُسے پتا چل جائے گا کہ یہ میرا عمل نیک اور مفید ہے، پھر وہ اس کی جزا ضرور دے گا اور مجھ پر خوش ہو گا، چاہے اُس کے فرشتوں نے کتنی بھی رشوت کھالی ہو۔ میرے پاس دُھواں تو نہیں ہے لیکن جو کچھ کر رہا ہوں وہ دھوئیں سے کم بھی نہیں۔ کل کی طرح آج پھر مجھے بہت سکون ملا۔

ایک اور جگہ پر لکھا تھا۔

آج میں نے وہاں دو بار پلیدی ماری۔ اس طرح میری صحت بھی اچھی رہتی ہے اور کام بھی اچھا ہو جاتا ہے۔ یہ کام اور بھی اچھا ہو گا، بس میری طبیعت ٹھیک رہے تو دیکھنا میں کتنا شاندار کام کرتا ہوں۔ لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں، ہاہاہا، حالانکہ اس ملک کی ساری عوام پاگل ہے مگر اپنے کو عقل والے سمجھتی ہے، سب عقل کے کانے لنگڑے، لولے اور اندھے ہیں۔ انھوں نے میرا ساتھ نہ دیا تو ایک دن سب ریں گے۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ سب ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخباروں والے میرے پاس آئیں گے اور میری چیزیں سونے میں تول کر لے جائیں گے۔

مجھے طے ہوا، یہ شخص پاگل نہیں تو خبطی ضرور ہے۔ ایک تو تمام تحریریں بے ربط تھیں، گرائمر اور جملوں کی ساخت بھی خراب تھی، اُس پر دعویٰ کہ سونے میں تولی جائیں گی لیکن اُس سے ملنے کا تجسس بڑھ گیا۔ مَیں نے دل میں تہیہ کر لیا، کل اُسے ضرور جا پکڑوں گا اور اُگلوا کے رہوں گا کہ وہ دراصل کون ہے؟ دوسرے دن فجر کے وقت ہی وہاں جا پہنچا مگر وہ موجود نہیں تھا۔ اُس کا تھیلا بھی غائب تھا۔ مَیں اُس کے لیے شک میں مبتلا ہو گیا یعنی یہ کوئی جاسوس ہے، جس کی تحریریں دراصل کوڈ ورڈز تھیں۔ رات مَیں اُس کے کاغذات چرا لایا تھا، اس لیے وہ وہاں سے بھاگ گیا تھا لیکن میرے یہاں بے وقت آنے سے اتنا ہوا کہ صبح کی فضا اور موسم انتہائی اچھا لگا۔ بچپن میں اماں جان اس وقت نماز کے لیے اُٹھایا کرتی تھی۔ صاف ستھری سڑک، جس پر کوئی آدم نظر نہ آتا تھا، چہچہاتے پرندے، خوبصورت درخت، جن پر کُہر کے گزرتے ہوئے غبار تھے۔ یہ سڑک سیدھی اس شہر کی سب سے بڑی مسجد کی طرف جاتی تھی، اس کے شمال کی جانب پہاڑ اور جنوب کی طرف پورا شہر آباد ہے۔ اسی مسجد کے پہلو میں ایک قبر بھی ہے۔ یہ قبر اُس جرنیل کی ہے جو گیارہ سال ملک کا صدر رہ کر ایک حادثے میں مارا گیا۔ مجھے نہ تو اس مسجد سے کچھ لینا تھا اور نہ قبر سے

سرد کار تھا، بس موسم اور منظر کی خوبصورتی کو دل میں اُتارنے کے لیے اُس طرف کو چل دیا۔ کافی دیر اس علاقے میں گھومتا رہا، جب تھک گیا تو سورج نکلنے کے ساتھ ہی واپس آ گیا۔ اس کے بعد میرا معمول بن گیا۔ مَیں فجر کی اذان کے وقت چہل قدمی کے لیے اُسی طرف جانے لگا۔ اسی دوران وہ تحریریں دوبارہ پڑھنے کی کوشش کی، جس میں مجھے دو نئی چیزیں نظر آئیں۔

بھائی حبیب اللہ، میں نے تجھے کئی دفعہ سمجھایا تھا مگر تُو نے میری ایک نہیں مانی۔ دیکھا، صغرا اور اماں کا کوئی پوچھنے والا نہیں رہا۔ ایک ٹرین کے نیچے آ کر مر گئی دوسری پاگل ہو کر۔ لوگ تو مجھے بھی پاگل کہتے ہیں لیکن میں اُن پر ہنستا ہوں۔ یہ جانتے ہی نہیں، اُن کے ساتھ اور میرے ساتھ کیا ہو گیا۔ میں نے تجھے کہا نہیں تھا ایسا نہ کرنا؟ ورنہ سب برباد ہوں گے، اب دیکھ لے، جاوید بھی تیرے قدم پر چلا اور وہاں مارا گیا، جو ہمارا وطن نہیں تھا۔ وہ علاقہ تو ہماری پچھلی کئی پشتوں نے نہیں دیکھا تھا، نہ وہ لوگ ہمیں جانتے تھے، نہ ہم اُنھیں جانتے ہیں۔ مروانے والے کئی آج بھی زندہ ہیں تیری طرح اُس نے بھی میری ایک نہیں سُنی اور ابھی تک مجھے نہیں پتا وہ کہاں مارا گیا، یا زندہ ہے؟

ان تحریروں کے پڑھنے کے بعد مَیں نے اُسے پھر ڈھونڈنا چاہا لیکن وہ نہیں ملا۔ بالآخر میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ شہر چھوڑ چکا ہے لیکن میرا اندازہ غلط تھا۔ ایک دن عصر کے وقت انتہائی شدید سردی میں ایف سیون تھری کے ایک ڈھابے پر میرا اُس کا سامنا ہو گیا۔ اُس دن کہر تو بالکل نہیں تھی لیکن ہلکی بارش اور تیز سرد ہوا جسم میں سوراخ کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر تھوڑا سا ٹھٹھکا لیکن بھاگا نہیں، یا آج اُس میں سکت ہی نہیں تھی۔ پاؤں میں جوتے بدستور نہیں تھے۔ ایک بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی دیسی اون کی چادر اوڑھے تھا۔ ہاتھ میں تھیلا بھی نہیں تھا۔ ٹوٹی چارپائی کے پاس بھیگی اور گیلی زمین پر بیٹھا چائے بنانے والے کی طرف لالچی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پاؤں سردی سے اکڑے ہوئے تھے، جنہیں ایک ہاتھ سے دبا رہا تھا اور کانپ رہا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آیا۔ مَیں ایک خالی چارپائی پر بیٹھ گیا اور ہوٹل کے مالک کو دو چائے بنانے کا آرڈر دیا۔ اُس کے بعد اُس شخص کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اُس نے تھوڑی دیر میری طرف غور سے دیکھا، پھر اُٹھ کر میرے پاس آ گیا لیکن چارپائی پر بیٹھنے کی بجائے نیچے بیٹھ گیا۔ مَیں نے اُسے چارپائی پر بیٹھنے کو نہیں کہا۔ اُس کے جسم سے سخت بدبو آ رہی تھی یا یہ میرا وہم تھا، پہلے ملا تھا تو ایسی بدبو نہیں تھی۔ شاید

اُس وقت مَیں نے اُس کی تحریریں نہیں پڑھی تھیں، جن میں بار بار گند اور بدبو کے لفظ آتے تھے۔
چائے آئی تو ایک کپ اُٹھا کر اُسے دیا اور گفتگو کا آغاز بھی کر دیا۔
دیکھیں نہ تو میرا پولیس سے تعلق ہے، نہ مَیں جانتا ہوں، آپ کون ہیں؟ کچھ اپنے بارے میں بتادو گے تو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔
میرے لہجے میں شاید ملائمت تھی یا چائے کا اثر، بالآخر بول پڑا، کیا پوچھنا ہے؟
نام بتادیں؟
وہ بغیر کسی توقف کے بولا، میرا نام مجید ہے۔ یہ نام میرے دادا نے رکھا تھا۔
کس شہر کے ہو؟
مریدکے، کا رہنے والا ہوں۔
تمھارا کوئی رشتے دار نہیں ہے؟ اس سردی میں خوامخواہ مر رہے ہو۔ اپنے گھر کیوں نہیں چلے جاتے؟
میرا رشتے دار یا گھر نہیں ہے، اُس نے بے پروائی سے جواب دیا۔
یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں نے بغیر وقفے کے پوچھا
کام کر رہا ہوں۔
لیکن مَیں نے جتنی بار تمھیں دیکھا ہے، اسی کسمپرسی اور مفلسی میں۔ کام کرتے ہو تو اُس کا معاوضہ کہاں خرچ کرتے ہو؟
کچھ کام معاوضے کے بغیر کیے جاتے ہیں، وہ پھر مختصراً بولا
تو پھر کیوں کرتے ہو؟
سکون کے لیے۔
بھائی کیا کرتا تھا؟
میرے اِس سوال پر اُس نے مجھے غور سے دیکھا پھر فوراً ہی چائے کا خالی کپ رکھ کر چل دیا حالانکہ بارش اور تیز ہوا مسلسل چل رہی تھی۔
اس ملاقات کے بعد مَیں اُس میں دلچسپی کھو بیٹھا تھا، چنانچہ اُسے آسانی سے جانے دیا بلکہ اُس کی بے وجہ کی بے نیازی اور جسم سے اُٹھتی ہوئی بدبو کے سبب مجھے اُس سے نفرت سی ہوگئی

اور مَیں نے تہیہ کر لیا کہ جاتے ہی اِس کے بے کار مسودے گندی نالی میں پھینک دوں گا۔ ان باتوں کے علاوہ، مرید کے، کے نام نے بھی مجھ پر کچھ اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔

اِس واقعے کو دو ہفتے گزر گئے۔ میری سیر اور چہل قدمی کا سلسلہ جاری رہا۔ معمول کے مطابق فجر سے آدھا گھنٹہ پہلے اُٹھتا، ایف ایٹ سے نکل کر شاہرہ فیصل پر آ جاتا، پھر ٹہلتا ٹہلتا فیصل مسجد کے سامنے جا نکلتا۔ وہاں سے بائیں پہلو کو مڑ کر پہاڑوں کی طرف ہو لیتا۔ پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر، وہاں رُکے بغیر اُسی راستے واپس آ جاتا۔ مکان پر پہنچتا تو سورج نکل رہا ہوتا۔ اس دوران نہ مَیں نے کبھی وہاں نماز پڑھی، نہ مسجد کے پہلو میں قبر کی طرف جانے کی کوشش کی، جسے دیکھنے کے لیے لوگ شوق سے بھی چلے آتے ہیں، پھر فاتحہ بھی پڑھ ڈالتے ہیں۔ ایک دن جب مَیں گزر رہا تھا تو قبر کی طرف سے ہلکا سا شور سنائی دیا، جیسے کوئی چیخیں، مار رہا ہو۔ ابھی تک فجر کی اذان نہیں ہوئی تھی اور اندھیرا کافی تھا۔ مَیں تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹھکا پھر آگے چل دیا لیکن شور شدید ہو رہا تھا۔ قبر پر موجود ایک بلب کی ٹھہر زدہ روشنی سے پانچ سات لوگ بھی نظر آ رہے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر میرے قدم بے اختیار اُس طرف اُٹھ گئے۔ قریب پہنچا تو عجیب منظر تھا۔ شدید سردی کے عالم میں گیلی گھاس پر ایک شخص ننگا اُلٹا لیٹا ہوا تھا، جس کی پیٹھ پر ایک پولیس والا بید مار رہا تھا۔ ایک اور پولیس والے نے اُس کی گردن اور بازوؤں کو بڑی قوت سے اپنی ٹانگوں کے شکنجے میں جکڑا تھا، ایک دوسرے شخص نے اُس کی دونوں ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں۔ ایک پولیس افسر بھی تھا، وہ کھڑا انہیں زور سے مارنے کا حکم دے رہا تھا۔ مَیں نے اُس شخص کو پہچان لیا، یہ وہی خبطی تھا۔ اِس منظر کو دیکھنے کے لیے کافی لوگ جمع ہو سکتے تھے مگر شدید سردی اور رات کی وجہ سے پانچ سات لوگ ہی ایسے تھے جنہیں یہ تماشا دیکھنا نصیب ہوا تھا۔

قبر کے پہلو میں اُسے اُلٹا اور ننگا لٹا کر پولیس والے بید مار رہے تھے اور جواباً گالیوں اور چیخوں کا ایک طوفان اُٹھ رہا تھا۔ چند لمحے محظوظ ہونے کے بعد مجھ میں اُس کے لیے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ مَیں نے پولیس افسر سے کہا، بھائی کیا مسئلہ ہے، اِسے کیوں مار رہے ہو؟

پولیس افسر نے غصے کی کیفیت سے میری طرف دیکھ کر کہا، بھائی! جائیں اپنا کام کریں یا جا کر نماز پڑھیں، میرا سر نہ کھائیں۔

مَیں نے بھی اُسی خشونت سے جواب دیا، ٹھیک ہے، سر نہیں کھاتا لیکن اِس شخص کے

مر جانے کی صورت میں مجھے اپنے خلاف ایک گواہ سمجھ لیں۔

کیا مطلب ہے آپ کا؟ پولیس افسر بولا

مطلب کا آپ کو نہیں پتا؟ مَیں نے کہا، اس سردی میں اسے بُری طرح ننگا کر کے مارنے سے، کیا یہ بچے گا؟

یہ خبیث نہیں مرے گا، آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اِس حرام زادے نے وہ کام کیا ہے کہ آپ کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکتے۔

کیا کیا ہے؟ مَیں نے بے چینی سے پوچھا۔

اس نے قبر کی بے حرمتی کی ہے، پولیس افسر بولا، اور یہ کام پچھلے کئی دنوں سے کر رہا ہے لیکن آج پکڑا گیا۔ ہمیں تو توقع ہی نہیں تھی کہ کوئی شخص ایسے بھی کر سکتا ہے۔

اب میرا دماغ اُن تحریروں کی طرف پلٹا، جنہیں مَیں پڑھ کر اور ناکارہ سمجھ کر پھینک چکا تھا۔ اچھا، تو یہ یہاں آ کر گند پھیلاتا تھا۔ مَیں دل ہی دل میں ہنسا، پھر سنجیدہ ہو کر پولیس افسر سے کہا، جناب اگر اس نے قبر کی بے حرمتی کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں اِسے مار ہی دیا جائے۔

میاں آپ کون ہیں، جو مجھ سے تفتیش کرنے لگے؟ اُس نے اب مجھے گھور کر پوچھا۔

میں ایک ٹی وی چینل میں کام کرتا ہوں اور یہاں روز چہل قدمی کرنے آتا ہوں۔

ٹی وی میں کام کرنے والی بات میں نے جھوٹ کہی تھی لیکن اُس کا اثر بہت ہوا۔ اُس نے اپنے ماتحتوں کو فوراً پٹائی سے روک دیا، جس کی وجہ سے شور بھی کم ہو گیا۔ اب اُس نے مجھے بازو سے پکڑا اور قبر کے قُبے کے پاس لے جا کر اُس کی طرف اشارہ کر کے بولا، یہ دیکھ رہے ہیں آپ؟ اس غلیظ آدمی نے کیا کیا ہے؟

میں نے تمام قبے پر نظر ڈالی لیکن نہ تو وہاں کوئی گند تھا اور نہ کسی قسم کی بدبو آ رہی تھی البتہ قبر اور قبے کی اردگرد کی جگہ کافی میلی تھی۔

مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا، میں نے اُکتا کر کہا۔

جناب پتا نہیں آپ کی آنکھیں ہیں یا ماتھے پر کھینچے بٹن لگائے ہیں۔ مجھے تو اس کنجر کی حرکت کو بتاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے، انسپکٹر نے اُس آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ حرامزادہ اس قبر کے قبے کے عین اُوپر بیٹھ کر مشت زنی کرتا ہے اور اپنے ناپاک نطفے کا پانی قبے پر

پھینک دیتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں، اس گھٹیا ترین اور قبیح فعل پر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ مجھے پندرہ سال پولیس نوکری میں ہو گئے، آج تک ایسے شیطان سے واسطہ نہیں پڑا۔ اتنی حرامی سوچ تو شیطان کو بھی نہیں آئی ہو گی۔

میں کیا بتاتا؟ میں نے مڑ کر اس آدمی کی طرف دیکھا، جو مار کھانے کے بعد کافی مضمحل ہو چکا تھا اور آنکھیں نیچے کیے بیٹھا تھا۔ اتنے میں مسجد سے اذان کی صدا گونج اُٹھی۔

پانڈو کے

شہزادو لالہ سنیئے! یہ دس سال پرانی بات ہے، مَیں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا، آپ کو تو معلوم ہی ہے، کتنا عرصہ مسجدوں کے مینار اور گنبد بناتا پھرا ہوں۔ دروازوں کی محرابیں، ڈاٹیں، مغلیہ طرز کی صراحیاں اور ایرانی مینا کاری کا کام دروازوں پر جس ہنرمندی سے کرتا تھا، یہ بات تو آپ سے چھپی نہیں۔ اسی سلسلے میں میری شہرت جب اپنے شہر سے باہر نکلی تو مجھے قصور کے ایک قصبے "پانڈوکی" میں مسجد کی تعمیر کا کام مل گیا۔ یہ وہی قصبہ ہے جس میں بلھے شاہ پیدا ہوا اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے نکل گیا۔

بلھیا جے توں غازی بننا، لکیں بنھ تلوار
پہلاں رنگڑ پانڈو ماریں پچھوں کافر مار
اُجڑ گئے پانڈوکے، تے نکھر گیا سدھار

واہ بھئی، بلھے شاہ بھی کیا جہاں دیدہ شخص تھا۔ کاش وہ یہ جہاد کرتا ہوا ہمارے قصبے تک آتا۔ شہزادو لالہ کا اشارہ اپنے قصبے کی کمبوہ برادری کی طرف تھا، جو لڑائی اور فساد میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔

دیکھو بھئی راہ میں ٹوکو گے تو مَیں کہانی سے پھسل جاؤں گا۔

ہاں جناب، آپ کو "پانڈوکی" میں مسجد کی تعمیر کا کام مل گیا، پھر کیا ہوا؟

ہاں تو مَیں کہہ رہا تھا، یہ قصبہ پندرہ ہزار کی آبادی پر مشتمل تھا۔ کوئی عورت زیور سے خالی نہیں اور کوئی مرد بندوق سے آزاد نہیں۔ قصبے کے بازار کھلے کھلے تھے، جن پر دو رویہ پیپل، نیم اور بیریوں کی قطاریں دور تک نکلتی چلی گئی تھیں۔ بہت بڑا چوک، سو فٹ قطر کا ہوگا۔ لوگوں کے

گھر کھلے اور بڑے بڑے احاطوں سے منسلک تھے۔ مسجد کے چاروں طرف ساٹھ فٹ کی چوڑی سڑک قصبے سے مسجد کو کاٹ دیتی تھی۔ پہلے دو چار دن تو مَیں نے اِس خوبصورت قصبے کو تجسس سے دیکھا، گلیوں اور بازاروں میں گھوم پھر کر اُن کی دیدہ زیبی سے لطف اندوز ہوا۔ بازاروں میں صاف پانی کے نالے درختوں کی بہار دکھاتے تھے لیکن اس سیر کے بعد بالکل مَیں اپنے آپ میں سمٹ آیا، جس کا سبب جلد ہی آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ اگر چہ مَیں پچاس فٹ کی بلندی پر کھڑا مناروں کا کام کرتا تھا لیکن پیپلوں کی بلندی اس سے بھی زیادہ ہونے کی وجہ سے میری سامنے والے گھروں کے صحنوں میں کھلی نظر نہ جاتی۔ ایک دفعہ مسجد کے عین سامنے والے گھر سے ہلکا سا نور کا چھپا کا پڑا، جس سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ یار لالہ کیا بتاؤں، ایسا چہرہ کہ سورج بھی اُس سے روشنی تاپے۔ سر کے بال گھٹنوں تک تو ہوں گے ہی۔ دیکھتے ہی میرے تو حواس مختل ہو گئے۔ اب کام تو مَیں منار پر کرتا، نظر دن بھر اُس صحن میں رہتی۔ ایک دن میرے ساتھ کام کرنے والا مزدور میری یہ کیفیت بھانپ ہی گیا۔ کہنے لگا کیا دیکھتے ہو راج صاحب؟ ان تلوں میں تیل نہیں۔ اپنے کام کی خبر لیں۔ قصبے کے حالات خراب ہیں۔ اُس کے اِس اشارے سے مَیں فوراً سنبھل گیا بلکہ اُس کے بعد مزدور کی چاپلوسی بھی شروع کر دی کہ کہیں کسی کو خبر نہ کر دے اور شکر ہے اُس نے یہ راز اپنے تک ہی رکھا۔ ویسے بھی پھر کبھی وہ نور نظر نہ آیا۔ کبھی انجانے میں نظر اُدھر اُٹھ جاتی تو اُس گھر کی چھتوں پر جا بجا کبوتروں کی ایستادہ چھتریاں میرا منہ چڑانے لگتیں۔ بہر حال کچھ ہی دن بعد مَیں نے اس طرف کا خیال چھوڑ دیا۔

تو آپ دستبردار ہو گئے؟ خیر یہ تو اچنبھے والی بات نہیں، بزدلی آپ کو وراثت میں ملی تھی۔

یہ بات نہیں لالہ جی، قصبہ ذہنی طور پر تھا ہی افغانستان۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ آپ سنیں تو سہی۔

بات کرتے جائیں، مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہاں کیا کیا عجوبے بستے ہوں گے۔ جہاں سے بلھے شاہ ہاتھ جھاڑ کے قصور روانہ ہو گیا ہو، اُس قصبے کے لوگ کوئی ایسے ویسے تھوڑی ہوں گے۔

ویسے تو ہر چیز چونکا دینے والی تھی لیکن وہاں جا کر جو پہلا حادثہ پیش آیا پہلے اُسی سے آغاز لیتے ہیں۔ مسجد کے سامنے جیسا کہ مَیں بتا آیا ہوں، چوڑی تارکول کی سڑک، جس کے دوسری طرف چار پانچ پیپل کے درخت تھے۔ رشید نام کا ایک پاگل پیپلوں کے سائے سے ہٹ کر عین

چوک میں تارکول کی سڑک پر صبح چھ بجے آ کھڑا ہوتا، آٹھ بجتے، دس بجتے، بارہ ہو جاتے، سہ پہر حتّٰی کہ شام اور پھر عشا بھی وہیں کر دیتا۔ جون جولائی کی کڑی دوپہروں میں پسینہ اُس کے اُوپر سے لے کر نیچے تک بہا چلا جاتا لیکن وہ وہیں جما رہتا اور مسجد کے دروازے کی طرف یعنی جہاں مَیں کام پر لگا ہوا تھا، دیکھتا رہتا۔ گاڑی بان، ٹریکٹر یا کار والے بڑی احتیاط سے خود اِدھر اُدھر سے ہو کر گزر جاتے مگر رشید میاں کے ارادے محکم تھے۔ وہ اپنے پاؤں کی زمین نہ چھوڑتا۔ مجھے انتہا درجے کی حیرانی نے گھیر لیا کہ یہ شخص آخر ہے کیا چیز؟ نہ کچھ بولتا ہے، صبح سے لے کر رات تک کچھ کھاتا پیتا نہیں اور دھوپ میں کھڑا سوکھتا رہتا ہے۔ کوئی شخص اُسے کچھ کہنے کی جرأت بھی نہیں کرتا۔ ایک دن اُکتا کر میں نے کہا، رشید بھائی! آپ جو سارا دن تارکول کی سڑک پر کھڑے جولائی کی دھوپ تاپتے ہو، تھوڑا اُدھر پیپلوں کے سائے میں کیوں چلے نہیں جاتے۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا" پاگل کہیں کا، او احمق کیا سردیاں نہیں آئیں گی"؟

بھیشہزاد لال! خدا گواہ ہے، میں چکرا گیا اور شرمندہ ہو کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اُس کے بعد مَیں اُس سے کبھی ہم کلام نہیں ہوا۔

خدا کی قسم تم سے سیانا تھا، واقعی اُس نے بڑی جلدی آپ کو پہچان لیا۔

یار ایک تو تم میں یہ خرابی ہے کہ بات ختم ہونے سے پہلے ہی فیصلہ سنا دیتے ہو، پہلے پوری کہانی تو سن لو۔

اچھا بھئی کہیے!

ہاں کہتا ہوں لیکن فی الحال اس رشید صاحب کو یہیں پر روک کر بات نئے سرے سے شروع کرتے ہیں۔

مجھے اس قصبے میں آئے ہوئے ایک ماہ ہو گیا تھا اور انتہا کا پریشان تھا۔ قصبے میں کوئی جگہ یا گھر ایسا نہ تھا، جہاں سے کتاب یا کسی اخبار کا ٹکڑا ہی پڑھنے کو مل جائے۔ اِدھر میرا ان چیزوں کے بغیر معدہ خراب ہو رہا تھا۔ آخر میں نے ایک دوکاندار سے، جو روزانہ قصور شہر سے تازہ سبزی اور سودا لے کر آتا تھا، کہا بھائی! روزانہ میرے لئے ایک اخبار اور ہر تیسرے دن کوئی کتاب خرید لایا کرو۔ اس کام کے لئے میں اسے نقد پیسے دے دیتا اور چاپلوسی الگ کرتا۔ اخبار کی حد تک تو وہ وہی لایا جس کا کہا گیا تھا البتہ پہلے دن جو کتاب لایا وہ" قوتِ باہ کے مجرب نسخے" تھی۔ خیر اس

میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا، یہ اُس قصبے کی کرامت تھی۔

کیوں، کیا وہاں حکیموں کے خاندان بستے تھے؟

بس سنتے جاؤ، اور بیچ میں مت ٹوکو۔

آٹھ دس ہوٹل تھے، جن پر آٹھ پہر بلیو پرنٹ چلتے اور جوا کھیلا جاتا۔ جس شخص پر عدالت میں مقدمہ نہ چل رہا ہوتا وہ معززین اور شرفا کی صف سے خارج سمجھا جاتا۔ پورے ضلع کے اَسّی فیصد واردات اسی قصبے کی دین تھے۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جب کسی گلی یا بازار میں ٹھاہ ٹھاہ نہ ہوگئی ہو۔ آج کسی کی ٹانگ ٹوٹی تو کل آنکھ پھوٹی جو روز امن کا گزرتا اسے نحوست کا دن سمجھا جاتا۔

جھگڑا کس بات پر ہوتا تھا؟

بس یونہی، کہ منیرے کا کبوتر میری چھتری پر کیوں آ بیٹھا یا پھر شریف کی بھینس ہمارے بازار سے گزرتے ہوئے گوبر کیوں کر گئی؟

یار ایسی حالت میں آپ وہاں کام کیسے کر رہے تھے؟ شہزادلالہ متوحش ہو کر بولا۔

بھائی یہ آپ کا سوال ٹھکانے کا ہے۔ ویسے تو وہاں پیپلوں کے پتوں میں بھی آسیب چھپے تھے لیکن اس کے باوجود دو باتیں بہت مثبت تھیں۔ میرے خیال میں اُنہی کی وجہ سے قصبہ ابھی تک آباد تھا۔ جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں وہاں بلھے شاہ پیدا ہوا تھا۔ اس کے والد اور والدہ کے مقبرے وہیں پر موجود تھے۔ اب یہ وہاں کی رسم تھی کہ جو شخص اُن مقبروں میں پناہ لے لے، وہ چاہے کتنے ہی بڑے خطرے میں کیوں نہ ہوتا اسے عافیت حاصل ہو جاتی۔ پھر معاملہ افہام و تفہیم سے طے کرنا ضروری سمجھا جاتا۔ خدا جانے یہ اچھی بات اُن گنواروں میں کیسے پیدا ہو گئی اور یہ روایت صدیوں سے چلی آتی تھی، جس کی ابھی تک خلاف ورزی نہ ہوئی۔ لہٰذا مَیں نے یہ سوچ لیا تھا کہ اگر کچھ گڑبڑ ہوئی تو یہیں آ کر پناہ لے لوں گا۔ دوسری بات یہ کہ مسجد کا معمار ہونے کی وجہ سے سارے قصبے کا مہمان تھا۔ آپس میں تو وہ جو کرتے، کرتے لیکن میری بہت عزت کرتے۔ اگر ایک آدمی چائے لے کر آ رہا ہے تو دوسرا اُس کی ضد میں میٹھی لسی کا جگ بھر لایا۔ تیسرے نے اُن دونوں کو مات دی، اور دیسی مرغے کا ڈونگا بھون لایا۔ یوں میرے دن اچھے گزرنے لگے۔ دن میں چار چار طرف سے کھانے کی دعوتیں آنے لگیں لہٰذا مجھے اُن کے دنگا فساد سے کچھ واسطہ نہ رہا۔ فقط کھانے پینے سے مطلب تھا۔ البتہ رہنے کے لئے میں کسی بھی گھر میں تیار نہ تھا کہ کسی بھی وقت فائرنگ

شروع ہوکر گولی میری کنپٹی پر آکر لگ سکتی تھی۔

پھر رات کا ٹھکانہ کہاں رکھا؟

اول تو دس دن مولوی صاحب کے گھر رہا، پھر وہاں سے بھاگ نکلا اور مسجد میں سونا شروع کر دیا۔

کیا مولوی صاحب قوم لوط سے تھے؟

بھئی ایک تو تم واہیات ایسے ہو کہ بندے کی شرافت ہوا ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب کا مکان بہت تنگ تھا دوئم اُس کی علمی شخصیت ایسی بے باک تھی کہ مجھے میر صاحب کی طرح اپنی زبان خراب ہوتی نظر آئی۔ مثلاً ایک دن لاؤڈ سپیکر پر جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے، فرمانے لگے۔

> دیکھئے! اصحاب قصبہ، عورت کا فرض ہے کہ وہ دو سال تک بچے کو دودھ پلائے۔ یہ شرعی قانون ہے لیکن حالت یہاں یہ ہے کہ ابھی ایک بچے کو پیدا ہوئے سال پورا نہیں ہوتا اور دوسرا بچہ پھڑک کر باہر آ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ چار سال میں آٹھ آٹھ بچوں کی لائن لگ جاتی ہے۔ نالائقو! ہمارے قصبے کی عورتیں کیا ہیں، چلتی پھرتی گلٹریائیں ہیں گلٹریائیں۔

حضرت یہ سن کر میں تو لاحول پڑھتا ہوا باہر نکل آیا۔ اُدھر لوگوں کی یہ حالت کہ سبحان اللہ جزاک اللہ سے داد دیے چلے جاتے ہیں۔ اُس دن کے بعد میں نے مولوی کے ہاں رہنے سے توبہ کر لی اور سات آٹھ روز مسجد میں گزارے۔

پھر اُس کے بعد کہاں رہے؟

اُس کے بعد میری دوستی شریف حسین سے ہو گئی۔ یہ مجھے پورے قصبے کا ولی نظر آیا۔ وہاں کا واحد آدمی تھا جو پانچ وقت آکر مسجد میں با جماعت نماز پڑھتا، بالکل خاموش رہتا اور اکثر میرے ساتھ قصبے والوں کے دنگا فساد کا گلہ شکوہ کرتا۔ کبھی کبھی چھوٹے موٹے مذہبی مسائل مثلاً غسل، وضو، جنازہ اور نکاح کی بابت بھی گفتگو کر لیتا۔ میرا حساب وہاں اندھوں میں کانا راجا جیسا تھا لہٰذا اپنی علمیت بگھارنے کے لئے ان مسائل پر سیر حاصل گفتگو کرتا۔ نکاح کے مسائل پر تو بہت دفعہ اس نے میری معلومات سے استفادہ کیا۔ شریف حسین کی عمر پینتیس سال سے اوپر نہ تھی مگر

کثرتِ سجدہ سے ماتھے پر محراب بن چکی تھی۔ اُس نے تو خیر مجھے یہ بات نہیں بتائی البتہ ایک دفعہ میرے ساتھ کام کرنے والے مزدور کی زبانی معلوم ہوا کہ مسجد کے سامنے والے گھر کی جمیلہ کے ساتھ چار سال پہلے اس کے عشق کا قصہ چلا تھا۔ یہ اُس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن چودھری سلیم نے رشتہ نہیں دیا۔ حالات کافی بگڑ گئے تھے مگر پھر چپ چاند ہوگئی۔ اب پندرہ نومبر کو جمیلہ کی شادی چک راڑے کے چودھری جمیل کے بیٹے سے طے ہے لیکن اس بارے میں میرے سوا کسی کو کان وکان خبر نہیں بلکہ یہ شادی کسی سبب سے فقط ایک قسم کی خاموش رخصتی ہی ہوگی۔

بہر حال مجھے ان باتوں سے کچھ غرض نہ تھی۔ مَیں تو یہ جانتا تھا کہ اس کسمپرسی اور قحط الرجال کے دور میں اس کی ذات میرے لئے غنیمت تھی۔ اکثر میٹھی لسی بنا کر لے آتا اور نہایت اخلاق کے ساتھ پیش آتا۔ مَیں اس کا یہ رویہ دیکھ کر اُس کے مکان میں اُٹھ آیا۔ شریف حسین نے ایک کمرہ رہنے کو مجھے دے دیا، جس کا دروازہ بازار کی طرف کھلتا تھا۔ یہاں مجھے ہر قسم کا سکون میسر تھا کیونکہ ایک تو اُس کا گھر بہت صاف ستھرا تھا دوسرا اُس کے ہاں اسلحہ کے نام سے ایک چھری تک دیکھنے کو نہیں ملی۔ بہت دھیمے لہجے میں بات کرتا۔ غصہ کیا چیز ہوتی ہے، شریف اس سے واقف نہیں تھا۔ میں پانچ بجے شام چھٹی کرتا۔ نہا دھو کر صاف کپڑے پہنتا اور باہر بازار کے سامنے موڑھا بچھا کر اخبار کے کالم یا دوکاندار سے منگوائی گئی کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دیتا۔ میرے رنگ و روغن سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ راہ چلتی بالیاں مچل مچل کر رہ جاتیں مگر جناب میں ایک ہی کائیاں۔ اصل میں تو قصبے والوں کے خوف سے لیکن ظاہراً اپنی فوں فاں قائم رکھنے کو آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا اور مطالعے میں مگن رہتا۔ ایک دن اسی سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہوا۔

ایک شام اسی طرح شریف حسین کے مکان کے سامنے بیٹھا میں اخبار پڑھ رہا تھا کہ پچاس لوگوں کا مجمع غل غپاڑہ کرتا ہوا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ مَیں سہا، کہ بھئی آج جان گئی، ہو نہ ہو اِن کو میرا بازار بیچ بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔ اب تو مارے گئے، کوئی پناہ دینے والا بھی نہیں اس لئے کہ شریف حسین تو فساد سے دُور رہنے والا محض ایک نمازی سا آدمی ہے۔ اُس وقت پہلی دفعہ مجھے کسی فسادی کی دوستی قابلِ رشک محسوس ہوئی۔ مَیں نے سوچا، شریف حسین نہ بچا سکے گا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں اور میں پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اسی اثناء میں میرے دائیں والا بولا، یہ لو دکھا دیا آپ کو، یہ ہے وہ لڑکا، جسے میں نے آپ کے قصبے میں پڑھتے ہوئے دیکھا۔ لو جلدی کرو اب نکالو دو ہزار

روپیہ۔ مَیں شرط جیت گیا۔

دراصل یہ ایک دودھ والا تھا، جو روزانہ میرے پاس سے گزرتے ہوئے عجیب نگاہوں سے گھورتا تھا۔

اسی وقت دوسرا بولا، شرط ہم جیتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے قصبے کا ہی نہیں۔

اب مجھے اصل بات کا پتہ چلا کہ اصل میں گوالے اور اس قصبے والے کے درمیان اس بات پر شرط لگی تھی کہ آیا پڑھنے والا لڑکا اس قصبے کا ہے یا نہیں۔ گوالا کہتا تھا، اُس نے ایک پڑھا کو لڑکا دیکھ لیا ہے، جو اس قصبے کا ہے جب کہ قصبے والے ماننے کے لئے تیار نہیں تھے آخر گوالا شرط ہار گیا۔

اچھا بھئی یہ تو ہوئی ایک بات، اب اصل کہانی کی طرف آیئے۔ دن ایک گھڑی رہ گیا۔

بس یار تسلی رکھ کہانی بہت کم رہ گئی۔

ہوا یہ کہ مجھے اس مکان پر رہتے ہوئے چار مہینے ہو گئے۔ شریف حسین نے میری تواضع میں کوئی کسر نہ چھوڑی، نہ ہی میں نے اس میں کوئی اوچھی حرکت دیکھی۔ وہ پڑھا تو بالکل نہیں تھا لیکن گنواروں والی بھی اس میں کوئی بات نہیں تھی۔ مَیں نے ایک دو دفعہ اُسے باور کرایا کہ یہ قصبہ اُس کے رہنے کے لائق نہیں۔ اُسے کہیں اور چلا جانا چاہئے لیکن شریف کا کہنا تھا، وہ آباؤ اجداد کی قبریں اور سینکڑوں ایکڑ زمین چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے۔ ویسے بھی قصبے والے اُس کی شرافت کی وجہ سے اُس کے منہ نہیں آتے۔ وہ اس بات میں سچا بھی تھا، واقعی میں نے ان چار ماہ میں کسی فرد کو نہیں دیکھا، جو اُس کے ساتھ ذرا بھی بدتمیزی سے پیش آیا ہو۔ ایک دن مسجد کے بیرونی دروازے پر کام جاری تھا۔ میں دروازے کے اُوپر بیٹھا چھوٹے مناروں پر نقش و نگار بنانے میں مصروف تھا کہ شریف حسین سرمئی رنگ کی چادر لپیٹے مسجد میں داخل ہوا۔ پندرہ بیس منٹ تک میرے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ میں نے محسوس کیا آج اُس کی آواز میں تھوڑی سی لرزش تھی غالباً کچھ بخار بھی تھا۔ بہر حال اُس کے بعد وہ مسجد کی محراب میں جا بیٹھا اور نوافل پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ پھر وہ محراب سے نہیں اُٹھا حتٰی کہ ظہر کی اذان ہو گئی۔ اُس کے بعد مولوی صاحب نماز پڑھا کر گھر چلے گئے اور میں کھانا کھا کر دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔

تین بجے اچانک دو کاریں سامنے والے گھر کے آگے آ کر رُک گئیں۔ اُسی لمحے گھر کا

دروازہ کھلا اور چار آدمی اندر چلے گئے۔ مجھے اپنے کام سے غرض تھی۔ میں نے ایک لحظہ انہیں دیکھا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سیمنٹ کی ضرورت پڑی، جس کے لئے میں نے مزدور کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ پلٹ کے دیکھا تو مزدور غائب تھا۔ کچھ دیر انتظار کیا مگر وہ مسلسل غائب۔ اسی لمحے میری نظر سامنے والی سڑک پر پڑی۔ وہ بھی بالکل ویران تھی۔ پھر اچانک میرا دل یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ چوک کے درمیان سے رشید میاں بھی غائب تھا۔ پچھلے چار مہینوں میں رشید میرے لئے چوک میں ایک ستون کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس وقت اُسے یہاں موجود نہ پا کر مجھے سب سے بڑا دھچکا لگا۔ اب میں نے سمجھا کہ کوئی انہونی بات ہوگئی ہے کیونکہ اس پورے سناٹے میں واحد میری ذات تھی جو ذی روح محسوس ہو رہی تھی۔ یا پھر پیپلوں کے پتوں کی سرسراہٹیں تھیں۔ اس عالم میں مجھے ایک انجانے خوف نے گھیر لیا اور یہ سب رشید کے چوک سے غائب ہو جانے کی وجہ سے تھا۔ قصہ مختصر میں ابھی یہ جائزہ ہی لے رہا تھا کہ کیا کیا جائے، اُسی لمحے شریف حسین تیزی سے محراب سے اُٹھا اور آنکھ جھپکنے سے پہلے دروازے پر آ گیا۔ اُس نے انتہائی پھرتی سے اپنے اوپر سے چادر ہٹا کر دور پھینکی تو میرے دیدے پھٹے رہ گئے۔ کلاشنکوف اور سینکڑوں گولیاں اُس کے جسم سے بندھی ہوئی تھیں۔ وہ جلدی سے اسی گھر میں داخل ہوا۔ علاوہ ازیں بازار میں دائیں بائیں دو چھتر کاڑ کیے۔ گھر کے اندر بھی دو تین منٹ گولیوں کے چلنے کی آوازیں آئیں۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرف بھاگوں، اُسی لمحے وہ دوبارہ ایک لڑکی کو کھینچتے ہوئے دروازے سے باہر نکلا۔ ایک دو برسٹ اُسی دروازے پر پھر مارے۔ اُس کے بعد کلاشنکوف کا رُخ میری طرف کرتے ہوئے حکم دیا کہ جلدی نیچے اُترو۔ مجھے ہوش تو کچھ نہ رہا البتہ اتنا یاد ہے کہ اُس کا حکم بے چون و چرا مان لیا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں لڑکی کا بازو تھا اور دوسرے میں کلاشنکوف۔ ہمیں دوڑاتے ہوئے سیدھا بلھے شاہ کے والدین کے مقبرے پر لے آیا پھر اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا اور مجھے حکم دیا کہ ایک منٹ کے لئے فوراً وضو کر کے دو نفل پڑھو، ایک منٹ سے پہلے۔ میں نے ایک دفعہ تو اُسے ملتجی نظروں سے دیکھا پھر جلدی ہی حکم کی تعمیل کر دی۔

واہ بھئی، یار تم تو بالکل ہی بزدل نکلے ہو۔ بندے میں کچھ تو آنا ہو۔

لالہ جی! خدا گواہ ہے۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اُس وقت وہ مجھے شریف

حسین نہیں بلکہ ڈریکولا لگ رہا تھا۔ بدمعاش کی بالکل ہی جون بدل گئی تھی۔ مجھے پتہ تھا ذرا بھی انکار کیا تو کہے گا، یہ مقبرہ صرف قصبے والوں کو امان دیتا ہے۔ پھر دو منٹ ہی کی تو بات تھی اور وہاں کوئی دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ نفل پڑھ چکا تو اُس نے مجھے کانوں کو ہاتھ لگانے کا کہا، وہ بھی میں نے لگا دیے۔

اُس نے تیرے ساتھ ایسا کیا کیوں؟

یہ مَیں نے بھی اُس سے پوچھا تھا۔

پھر کیا کہا اُس نے؟

اُسے اطلاع ملی تھی کہ مَیں نے آتے ہی اُس کی محبوبہ پر آنکھ رکھ لی تھی۔ وہی تو وہ نور تھا جو پیلوں کی اوٹ میں گھر کے صحن کو روشن رکھتا تھا۔

ہت تیرے مزدور کی، آگے کیا ہوا؟

اُس کے بعد اُس نے فرمان جاری کیا کہ مولانا صاحب کان چھوڑو اور جلدی سے ہمارا نکاح پڑھو۔ اس سارے منظر میں ایک دفعہ تو میرا سر چکرا گیا لیکن پھر مجھے اپنے حواس بحال کرنے پڑے۔ کیونکہ کام بڑا سخت تھا۔

پھر؟

پھر جناب مَیں آپ کی اطلاع کے لئے عرض کروں کہ وقت پڑنے پر مَیں نکاح بھی پڑھا سکتا ہوں۔

نکاح کے گواہ کہاں سے آئے؟

حضرت میرے ساتھ کام کرنے والا مزدور اور رشید میاں کس مرض کی دوا تھے؟

گرد

یہ ایک بہت کھلا احاطہ تھا، جس کے چاروں طرف تین منزلہ مکان اور مکانوں کی دیواریں ننگی اینٹوں سے اُوپر تک اُٹھی ہوئی اتنی بھدی تھیں کہ دیکھنے سے طبیعت پر بوجھ پڑتا۔ احاطے کے ایک کونے میں کاٹھ کباڑ کے ڈھیر، دوسری طرف پُرانے ٹائر اور جلے ہوئے کوئلے کی راکھ جمی تھی۔ اِن سے کافی دُور ویلڈنگ کا پلانٹ تھا، جس کے اردگرد لوہے کے ٹکڑے اور ٹیڑھی میڑھی سلاخیں بکھرے ہوئے کوئلے سے مل کر عجیب کرختگی کا احساس پیدا کرتیں۔ اسی احاطے میں سب سے الگ بائیں جانب وہ فیکٹری تھی، جس میں کام کرتے مجھے دس دن ہو گئے۔ یہاں میں خادم علی کے توسط سے پہنچا تھا۔ اُسے بس اتنا جانتا ہوں کہ لاہور کی کسی گمنام گلی میں رہتا تھا۔ ہم دونوں پندرہ دن تک اکبری منڈی کے قریب گتا ڈھوتے رہے۔ اسی عرصے میں اُس سے واقفیت ہوئی۔ اس کے بعد وہ یہاں سے چھوڑ گیا۔ ایک دن دوبارہ آیا اور مجھے یہ کہہ کر ساتھ لے گیا کہ ایک جگہ ڈگنی مزدوری پہ کام مل رہا ہے، وہاں چلتے ہیں۔

یہ جگہ بادامی باغ کے پچھلی طرف نہایت گندے علاقے یعنی کاٹھ کباڑ اور کچرے کے ڈھیروں میں تھی۔ میرے اور خادم علی کے علاوہ یہاں سات مزدور اور تھے۔ آپ اِسے چھوٹا سا کارخانہ کہہ لیں، جو تیس مربع فٹ کمرے میں نصب تین عدد چکیوں پر مشتمل تھا۔ کمرے کے آگے چالیس مربع فٹ کا مزید صحن تھا۔ صحن میں خام مال پڑا ہوتا، جسے ہم چکیوں کے ذریعے اصل مال کی شکل دیتے۔ یہ خام مال کیا تھا؟ اس بارے میں زیادہ نہیں بتا سکوں گا مگر اِن میں سے دو چیزوں کو جانتا ہوں۔ ایک ناکارہ سیلوں کے درمیان سے نکلا ہوا سیاہ سِکہ اور دوسرا بجھا ہوا چونا۔ یہ سِکہ کس چیز سے بنتا ہے؟ اس کی مجھے خبر نہیں مگر وہ سیل جن کے درمیان یہ پایا جاتا ہے، ریڈیو اور اس جیسی

دوسری الیکٹرک چیزیں چلانے کے کام آتا ہے۔ یہ کالے رنگ کا سکہ یا کوئلہ کہہ لیں، ہمیں چکیوں کے ذریعے پیسنا پڑتا۔ سکہ پیسنے والی بڑی چکی پانچ ہارس پاور کی موٹر کے ساتھ ایک چیختا ہوا بھوت تھی، جو سکے کے ساتھ سماعت اور عقل بھی سلب کر لیتی۔ باقی دو چکیاں چونا اور ایک اور چیز پیسنے کے کام آتیں۔ جس وقت تینوں چکیاں چلتیں تو ان کا شور احاطے کے در و دیوار میں گونجتا۔ پسے ہوئے سکے کی گرد سانس کے ذریعے نتھنوں سے ہو کر گردوں اور تلی تک پہنچ جاتی۔ گرد اتنی بدذائقہ تھی کہ کام کے پہلے دو دن میں نے کئی بار قے کی اور خادم علی کی جان کو کوسا۔ کالا سیاہ اور گرد آلود کمرہ اور اس میں موجود چکیاں ایسی چڑیلیں تھیں، جس میں کام کرنے والے آکسیجن کی بجائے کالی گرد پھانکتے۔ ہم سارا دن سکوں اور چونے کو پیس کر سیاہ میدے کی شکل میں تیار کرتے، پھر اس میں دو تین قسم کے مزید پاوڈر ملاتے، جن کے متعلق ہماری معلومات صفر تھیں۔ ایک پاوڈر تو ایسا کہ پیکٹ کھلتے ہی بدبو کے بھبھوکے اُٹھتے اور ناک بند کرنے کے باوجود سانس کو پھاڑ کر سینے میں اُتر جاتی۔ ہمیں بالکل نہیں پتا تھا، ہم کیا بنا رہے ہیں؟ صبح چھ بجے کام پر کھڑے ہوتے اور شام چھ بجے تک لگے رہتے۔ سکہ پیستے ہوئے منہ، سر اور جسم پر کالے رنگ کی ایسی تہیں چڑھ گئیں گویا سیاہ بھٹیوں سے نکالے ہوں۔ نہ صرف یہ کہ ہم مطلق کالے ہو چکے تھے بلکہ در و دیوار میں ایک ڈرا دینے والی سیاہی جذب ہو گئی، جیسے یہ کمرہ بجھی ہوئی دوزخ ہو۔ اس سے بڑھ کر ایک اور بات، جو فیکٹری کی نحوست میں اضافہ کرتی، وہ سکے کا وزنی پن تھا۔ اس کی موجودگی میں ہر چیز بھاری بھاری ہو گئی۔ سالم سکہ جب پس کر میدہ ہو جاتا تو وزن میں مزید اضافہ کر دیتا۔ یوں سیاہی اور وزن نے مل کر یہاں کے ماحول میں اتنا ڈپریشن پیدا کر دیا کہ سب مزدور بلاوجہ ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کیفیت میں رہتے۔ میں ان میں نیا تھا اور چھوٹا بھی چنانچہ خادم علی کے علاوہ ہر ایک اپنا ڈپریشن مجھ پر اُتارتا۔ ایسے لگتا اِن سب بڑے جانوروں میں واحد ایک میں چوہا ہوں۔ اس دباو کے اثر میں میری ذات سمٹ کر چھوٹی ہوتی گئی، جس سے آزاد ہونے کی طاقت مسلسل سلب ہو رہی تھی۔ میں سوچنے لگا، جتنی جلدی ہو سکے اس جہنم سے نکل بھاگوں۔ اگرچہ عام معاوضے کی نسبت یہاں معاوضہ دُگنا تھا مگر ایسی کالی اور بھاری چیزوں کے درمیان کام کرنا آسان نہ تھا۔

سوائے ہماری فیکٹری کے اس احاطے میں ہر چیز واضح تھی یعنی ایک طرف چھپڑا ٹائروں کا کام، ایک طرف ویلڈنگ اور کوئلے کی ٹال مگر ہماری فیکٹری محض ابہام تھی۔ ایسا ابہام

جس کے اندر سیاہی پھیلتی جائے اور جیسے آگے بڑھیں، اندھیرے کا اژدھا نگلنے لگے۔ سیکڑوں بار پوچھنے کے باوجود نہ بتایا گیا کہ ہم کیا بنا رہے ہیں اور کیوں بنا رہے ہیں؟

احاطے میں پانی کا ایک نلکا بھی تھا، جو گھنٹوں کے حساب سے ایک بالٹی بھرتا۔ اتنا کم پانی فقط ہاتھ منہ دھونے کے کام آتا۔ سیاہ سِکّے کی تہیں جسم پر چڑھنے کے سبب خارش اور قریب سوئے منحوس مزدوروں کے خراٹے ایک نہ ختم ہونے والی اذیت میں مبتلا رکھتے اور مَیں خادم علی کو گالیاں دیتے رات کاٹ دیتا۔ مزدوروں کی ایک دوسرے کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ فقط اِن میں خادم علی ذرا بہتر آدمی تھا۔ وہ اپنے حصے کا کام نپٹا کر اکثر میری مدد کر دیتا۔ خاص کر اُس وقت جب سِکّے کی بھری ہوئی بوریاں گاڑی سے نیچے اُتارنا ہوتیں۔ خادم علی کی ہلکی داڑھی کے ساتھ سر پر بھاری بال تھے۔ مَیں کام چھوڑ دیتا مگر پچھلے پانچ دن کی مزدوری فیکٹری مالک سیٹھ اسلم کے پاس تھی، جو اچانک کام چھوڑنے پر ڈوب جاتی چنانچہ مجبوراً لگا رہا۔

فیکٹری مالک سیٹھ اسلم چھ فٹ قد کا ایک طاقتور آدمی تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور آدمی ہوتا۔ اُسے وہ ڈیوڈ کے نام سے بلاتا۔ ڈیوڈ کے گلے میں صلیب لٹکی رہتی اور ہیئت کے اعتبار سے بھی کرخت لگتا۔ مذاق میں پھکڑ پن اور شوخی ضرورت سے زیادہ تھی۔ ہر وقت بازو کی مچھلیاں اور سینے کے اُبھار دکھانے کی کوشش کرتا۔ مَیں نے اُسے کبھی سنجیدہ بات کرتے نہیں دیکھا۔ سیٹھ اسلم نے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوتے اور کلین شیو بنائے رکھتا مگر بات کرتا تو گنوار پن نہ چھپتا۔ مزدوروں کے ساتھ اکثر اُن کی بیویوں کے متعلق گھٹیا جملے کستا، جنھیں مزدور ہنس کر سُنتے۔ میرے ساتھ نرمی سے پیش آتا مگر مجھے اُس کے پاس کھڑے ہوئے گھن آتی۔ اُس کے پاس ایک سفید رنگ کی اٹھاسی ماڈل کرولا تھی، جسے احاطے کے گیٹ سے اندر کر کے دُور ہی کھڑی کر دیتا تا کہ سِکّے کی گرد سے بچی رہے۔ کار جونہی گیٹ کے اندر داخل ہوتی، اُسی لمحے دو مزدور بھاگے ہوئے جاتے اور کار کی ڈِگی سے پاوڈر کے پیکٹ کارخانے لے آتے، جہاں ہم کام کر رہے ہوتے۔ فیکٹری مالک سیٹھ اسلم ڈیوڈ کے ساتھ دو گھنٹے کے لیے آتا اور اپنی موجودگی میں پسے ہوئے سِکّے میں یہ مختلف قسم کے پاوڈر مکس کراتا۔ مکسنگ ہم مزدور ہاتھوں سے مَل مَل کے ایسی احتیاط سے کرتے کہ پاوڈر سِکّے کے ساتھ یک جان ہو جاتے۔ سیٹھ اسلم اِس مال کو چھوٹے تھیلوں میں بھر کر ایک پک اپ میں رکھواتا، جو ہمارے پاوڈر مکس کرنے کے عرصے میں وہاں پہنچ جاتی۔ پک اپ میں

خام بھک بھرا ہوتا، جسے وہ جانے کہاں سے اکٹھا کر کے لاتی۔ ہم میں سے کچھ مزدور اُس سے سکہ اُتار کر خالی کرتے اور تیار شدہ مال لوڈ کر دیتے۔

سر کے بالوں میں پھنسی گرد اور چکیوں کے بے تحاشا شور کی وجہ سے دماغ پر ایک بوجھ سا تھا۔ جن چار پائیوں پر ہم سوتے، اُن کے کالے بان میں سکے کی گرد اور اُس گرد میں رینگتے ہوئے کالے کھٹمل کی آبادی برسوں ہوئے، اپنی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ بان پر چڑھی تہہ در تہہ چکنی مَیل سے رُواں رُواں کانپ اُٹھتا اور مَیں اُس کے قریب جانے سے ڈرتا مگر احاطے میں کچرا کباڑ اور گھاس پھونس کی بہتات نے بیسیوں سانپ پیدا کر دیے، جو سکے اور کھٹملوں سے بہر حال زیادہ خطرناک تھے۔ مجھے ہر حالت میں یہاں سے نکلنا تھا مگر میرے اور خادم علی کے بار بار اصرار پر بھی ہم سیٹھ اسلم سے پیسے لینے میں ناکام ہو گئے۔ مجھ سے زیادہ فکر خادم علی کو تھی، جس کی گردن پر میری مزدوری کا وزن بھی تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مزدوری دبالی جائے گی۔

سہ پہر کے وقت سیٹھ اسلم ڈیوڈ کے ساتھ احاطے میں داخل ہوا، اُس نے گاڑی معمول کے مطابق دور ہی کھڑی کر دی۔ اُن کے آتے ہی چکی بند کر دی گئی۔ احاطے میں ہر طرف گرد کی سیاہ چادر چڑھ چکی تھی۔ سیٹھ اسلم کونے میں رکھی گئی کرسی پر بیٹھ گیا، جسے وہ گاڑی کی ڈکی سے نکال کر لایا تھا اور قہقہے لگا کر کام کرتے مزدوروں کو جگتیں مارنے لگا۔ میرا کام کو بالکل جی نہیں لگ رہا تھا چنانچہ اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگا۔ ڈیوڈ نے آگے بڑھ کر میرے کان کے نیچے ہلکی سی چپت لگائی اور کہا، کیوں بئی تیرے ہاتھوں پہ مہندی لگی ہے؟ سیٹھ اسلم نے اِس بات پر ڈیوڈ کو جھڑکا۔ میں نے سیٹھ اسلم کے اِس رویے سے حوصلہ لے کر کہا! سیٹھ مَیں واپس جانا چاہتا ہوں، میرا حساب کر دیں۔

خادم علی نے فوری تائید کی اور بولا، ہاں سیٹھ پانچ دن سے مزدوری نہیں ملی، آج حساب کر دو۔

خادم علی تمھیں کس نے وکالت دے دی؟ سیٹھ نے تمسخر اُڑایا۔

سیٹھ! اسے کام پر مَیں لایا تھا، خادم علی کام کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ایک اور بات سن لے، مَیں خود بھی جانا چاہتا ہوں۔

خادم علی کا جواب سُن کر سیٹھ اسلم ٹھنڈا ہو گیا اور بولا! خادم علی تم تو ناراض ہو گئے، کل

شام تک آپ کو اُجرت مل جائے گی اور پرسوں کام پر نہ آنا۔

فیکٹری مالک کے اس جواب سے مَیں نے سوچا ایک دن اور اِس جہنم میں سہی۔

مغرب کے قریب وہ چلا گیا تو مَیں نے ایک مزدور سے پوچھا، سیٹھ کل پیسے دے دے گا؟

بڈھے مزدور نے جواب دیا لڑکے، سیٹھ کو پتا چل گیا ہے کہ تم کام نہیں کرنا چاہتے۔ جب نئے مزدور ملیں گے، تب آپ کو پیسے دے گا اور اس کام پر آسانی سے کوئی نہیں آتا۔ اس کالی دنیا میں جو آتا ہے دوسرے دن بھاگ جاتا ہے۔

رات آٹھ بجے خادم علی نے مجھے اشارا کیا، مَیں اُس کے پیچھے چل پڑا، گیٹ پر پہنچ کر اُس نے چاروں طرف دیکھا اور نزدیک ہو کر بولا! علی فکر نہ کر، مَیں شوکت پہلوان کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر کل تجھے پیسے لے کر نہ دیے تو پیشاب سے داڑھی منڈا لوں گا۔ شوکت پہلوان یہاں کا مشہور دادا ہے، دو موری گیٹ کے پاس رہتا ہے۔ تُو بے فکر ہو کر سو جا، مَیں اُس سے بات کر کے آتا ہوں۔ یہ کہہ کر خادم علی باہر نکل گیا اور مَیں واپس اپنی چارپائی پر لوٹ آیا۔ اس کے بعد میرا دھیان فلموں میں موجود اُن پہلوانوں کی طرف چلا گیا جو غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ مَیں خیالوں میں پہلوان کو فلمی ہیرو کے روپ میں دیکھنے لگا۔ انھی فکروں میں جانے کب نیند آ گئی۔ صبح اٹھا تو خادم علی نے مجھے بتایا کہ شوکت پہلوان سے بات ہو گئی ہے، اُس نے رات ہی سیٹھ اسلم کی طرف بندہ بھیج دیا تھا۔ آج اُس کے بندے یہاں بھی آئیں گے۔

کام شروع ہوا تو ہم بھی پیسے ملنے کی آس میں کام پر جت گئے۔ دن کا پہلا حصہ پہاڑ کی طرح کٹا۔ جسم کے روں روں پہ جمی میل اور کالک سے خارش پہلے سے بھی ہو اٹھی اور بال تو کب ایک دوسرے سے جُڑ کر یوپی سادھوؤں کی طرح غلیظ ہو چکے تھے۔

ساڑھے تین بجے سیٹھ اسلم فیکٹری میں آیا تو معمول کے خلاف آج اُس کے ساتھ ڈیوڈ کے علاوہ دو آدمی اور تھے، جو دیکھنے میں ہی وحشی لگتے لیکن وہ دُور ہی ویلڈنگ والے کے پاس بیٹھ گئے۔ ڈیوڈ معمول کے مطابق کام کروانے لگا۔ وہ بار بار مجھے اور خادم کو طنزیہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ہماری نظریں احاطے کے دروازے کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ چھ بج گئے مگر پہلوان کے آدمی نہ آئے۔ میری طرح خادم علی کی بے قراری بھی دیدنی تھی۔ اس اضطراب میں خارش کچھ زیادہ تیز ہو گئی۔ سر کے بالوں میں سِکے کی اتنی تہیں چڑھ گئیں کہ ناخن جلد تک پہنچنا ناممکن ہو گئے۔ کام مکمل

ہو چکا تو سیٹھ اسلم نے سوائے میرے اور خادم علی کے تمام مزدوروں کو اُجرت دے دی۔ ہم دونوں سیٹھ کا منہ دیکھنے لگے۔ آخر خادم علی نے کہا، سیٹھ جی ہمارا حساب؟

سیٹھ اسلم ڈیوڈ کی طرف منہ کر کے مسکرایا اور خادم علی سے مخاطب ہو کر بولا، بھئی خادم تم دونوں کا حساب تو شوکت پہلوان نے کرنا ہے؟ جا کر اُس سے پیسے لے لو۔

خادم علی ایک دم متعجب گیا، جیسے اُس کی چوری پکڑی گئی ہو، پھر سٹ پٹا کر بولا، سیٹھ یہ ٹھیک بات نہیں، ہم اتنے گند میں کام کر رہے ہیں۔ جب تُو پیسے نہیں دے گا تو کسی کے پاس تو جانا پڑے گا۔ پھر ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا یہ دھندا کون سا ہے؟

دھندا تیری بیوی کرتی ہو گی بے شرم، سیٹھ اسلم غصے سے بولا، ڈیوڈ یہ رات شوکت پہلوان کو بھی یہی کچھ کہتا رہا ہے۔ ابھی اِس کو یہ تو بتا دیں یہ دھندا کون سا ہے؟ اس کے دل میں ارمان نہ رہے، بلا ذرا چھکو اور دارے کو۔

سیٹھ کی آواز سنتے ہی ویلڈنگ پلانٹ پر بیٹھے دونوں آدمی دوڑ کر آ گئے۔ اِدھر ڈیوڈ نے ایک تھپڑ کھینچ کر خادم علی کے کان پر جمایا۔ جواباً خادم علی نے پسے ہوئے سِکے کی مٹھی بھر کر ڈیوڈ کے منہ پر دے ماری۔ سِکے کی گرد سے ڈیوڈ باولا سا ہو گیا، زور زور سے کھانسنے لگا اور آنکھیں اُبل پڑیں۔ اس کے بعد دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ دوسرے دونوں نے بڑھ کر ڈیوڈ کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ میں جو ابھی تک تذبذب میں تھا، فوراً دونوں ہاتھوں سے ڈیوڈ کو مکے مارنے لگا۔ اِس جرات پر ایک نے مجھے دبوچ لیا۔ مزدور دیوار کے ساتھ چپکے لگے کھڑے تھے، جیسے فلم دیکھ رہے ہوں۔ ڈیوڈ اور اُس کے ساتھی نے خادم علی کو اپنے گھٹنوں کے نیچے دبا لیا۔

رسی پکڑو، سیٹھ اسلم نے ایک مزدور سے کہا، دونوں کے ہاتھ پاوں باندھ دو اِن رسیوں سے اور پانی کی بالٹی لے کر آؤ۔

ایک مزدور نے بھاگ کر رسی پکڑ لی اور دوسرا پانی لینے چلا گیا۔ آن کی آن میں ڈیوڈ نے ساتھیوں سے مل کر ہم دونوں کو رسیوں سے باندھ دیا۔ کسی مزدور نے اِس تمام کارروائی میں ہماری ذرا مدد نہ کی۔

ڈیوڈ نے ہمارے سر پر ایک ایک لوٹا پانی انڈیل دیا اور پاوڈر، جو ہم نے مکس کیا تھا، اُٹھا کر میرے سر پر اور خادم علی کے سر، داڑھی اور مونچھوں پر مَل دیا۔ تمام مزدور چپ سادھے کھڑے

تھے۔ ہم اُس پاؤڈر کی بدبو میں ایسے ڈوبے کہ حواس باختہ ہو گئے۔ مَیں دل میں پہلوان کو گالیاں دے رہا تھا اور خادم علی کو کوس رہا تھا کہ خواہ مخواہ مدد لینے چلا گیا۔ اب میرے لیے مسئلہ اُجرت کی وصولی نہیں بلکہ اِس مصیبت سے نکلنے کا تھا۔ آٹھ دس منٹ یونہی بیٹھے رہے۔ مَیں رونے لگا تو ڈیوڈ نے دوبارہ سروں پر پانی ڈال دیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو سر کے سارے بال پانی کے ساتھ میری جھولی میں آ پڑے، مَیں یہ کھیل دیکھ کر حیران رہ گیا اور خادم علی کی طرف دیکھا۔ اُس کے سر، مونچھوں اور داڑھی سمیت ہر شے گنجی ہو چکی تھی اور خادم علی انسان سے زیادہ ایک ٹنڈ الگ رہا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر گالیاں دینے لگا۔ سیٹھ اسلم بولا، لے بیٹا دیکھ لے، اچھی طرح سے میرا کاروبار؟ یہ پاؤڈر عورتوں کے نیچے کے بال صاف کرتا ہے اور تیرے جیسے مردوں کے اُوپر کے بال۔ اتنا کہہ کر اُس نے جیب سے کچھ پیسے نکالے اور ایک مزدور کو دے کر بولا، شریفے میرے جانے کے بعد انھیں کھول دینا اور یہ دونوں کی مزدوری دے کر لات مار کے احاطے سے باہر نکال دینا، آخر شوکت پہلوان ہمارا یار ہے کچھ اُس کا بھی لحاظ کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد وہ ڈیوڈ اور دو نئے ساتھیوں سمیت اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ شریفے نے ہمارے ہاتھ کھول دیے اور پیسے جھولی میں رکھ دیے، ہم کچھ دیر اپنے کٹے ہوئے بالوں کو ہاتھ میں لے کر حیرانی سے دیکھتے رہے۔ خادم علی وقفے وقفے سے گالیاں دے رہا تھا۔ آخر پیسے پکڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گنے تو پورے تھے۔ رہ رہ کر میرا ہاتھ اپنی تازہ ٹنڈ کی طرف جاتا، جہاں صاف میدان تھا اور محسوس ہوتا جیسے بھاری گٹھڑی اُتر گئی ہو۔ رات نو بجے ہم دونوں احاطے سے نکلے۔ خادم علی آگے آگے تھا اور میں پیچھے پیچھے۔ اچانک خادم علی رُکا اور ایک طرف اشارہ کر کے بولا، وہاں سے تانگے ریلوے اسٹیشن پر جاتے ہیں، اتنا کہہ کر ہاتھ ملائے بغیر دوسری طرف چل دیا۔ مَیں کچھ دیر وہیں کھڑا اُسے دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ ایک اندھیری اور تنگ سی گلی میں غائب ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے مَیں نے اپنی ٹنڈ پر دوبارہ ہاتھ پھیرا اور ہلکے پھلکے سر کے ساتھ تانگے کی طرف چل دیا۔

سفید موتی

وہ ہم سے پانچ گھر چھوڑ کے رہتا تھا لیکن یہ بات میں نہیں جانتا تھا۔ مَیں نے تو اُسے صرف سکول میں دیکھا۔ اُس دن بالکل یہی موسم تھا، اکتوبر کے پہلے دس دن گزر چکے تھے اور دھوپ میں گرمی نہیں تھی۔ وہ کھلے گراونڈ میں کُرسی پر بیٹھا، اتنا پُرسکون تھا، جتنا کوئی خزاں رسیدہ درخت ہو سکتا ہے۔ پُشت کو کرسی پر ٹکا کر، دونوں پاؤں زمین پر سیدھے رکھے، اُس کی نظریں آسمان کی بلندی پر دائرے میں اُڑتی اُن چار عدد چیلوں پر تھیں، جو ہر چکر کے بعد مزید بلند ہو جاتیں اور اب نُقطوں کے برابر رہ گئیں تھیں۔ مَیں اُس کے پیچھے چپکے کھڑا دیکھتا رہا۔ مجھے یقین تھا مَیں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ جب وہ سفید موتی جیب سے نکالے گا تو میں ضرور دیکھ لوں گا لیکن کافی دیر کھڑے رہنے کے باوجود ایسا نہ ہوا۔ وہ ہر طرف سے ساکت، دونوں بازو کُرسی کی دستیوں پر رکھے بیٹھا رہا۔ اُس کی نظریں چیلوں سے ہٹ کر، سکول کی چار دیواری سے باہر، آموں کے باغ کی طرف مُڑ گئیں، جہاں رنگ رنگ کے پرندے سبز پتوں میں جھول رہے تھے اور تین بچے اُچھل اُچھل کر آم کی موٹی شاخوں سے اُلٹے سیدھے لٹکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مَیں دل ہی دل میں اُس پر تلملانے لگا۔ آخر وہ کیوں اپنا ہاتھ جیب کی طرف لے جا کر انڈے کے برابر کا سفید موتی نہیں نکالتا۔ اِسی بے دھیانی میں آگے ہوتا گیا اور نہ جانے کب اُس نے میرے قدموں کی چاپ سُن لی۔ اُسی وقت اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ میں دو قدم پر تھا، اُس کے دیکھتے ہی بھاگ اُٹھا اور ہانپتا ہوا کلاس میں آ گیا، جو ایک دوسرے گراونڈ میں گھاس کے فرش پر بیٹھی تھی۔ کلاس میں داخل ہو کر مَیں لڑکوں کے درمیان میں بیٹھ گیا۔

سکول کافی بڑا تھا، بہت بڑا، لیکن چار دیواری چھوٹی تھی، اتنی چھوٹی کہ تین فٹ کا بچہ

مضافات کو دیکھ سکتا تھا۔ سامنے کی مسجد کے اُونچے مینار اور اُن کے سفید گنبدوں پر بیٹھے یا اُڑتے ہوئے کبوتر ایک طرح سے سکول کا حصہ تھے۔ چار دیواری کے اردگرد ہری فصلوں کے پھیلے ہوئے کھیت اور بڑے باغوں کے سیاہ جھرمٹوں کا سایا سکول میں چلا آتا اور گراؤنڈوں کی سبز گھاس سے مل کر اِس میں طلسم سا پیدا ہو جاتا، پھر وہ طلسم دھوپ کو اپنے حصار میں لے لیتا۔

مجھے سکول میں دوسرا سال تھا۔ اِس عرصے میں کبھی نہیں دیکھا، وہ اساتذہ کے پاس بیٹھا ہو یا اُس نے سٹاف روم کا رُخ کیا ہو۔ بس کسی گراؤنڈ کے دُور کونے میں کرسی پر خوش بیٹھا، آسمانی سے نیلے، بھورے یا کالے بادلوں والے آسمان کو دیکھتا رہتا یا کبھی کبھی کتاب کھول کے پڑھنے لگ جاتا، جو وہ گھر سے لانا نہ بھولتا۔ ایسا بھی ہوا کہ سکول کے مغربی کونے میں، جہاں ایک چھوٹا سا پلاٹ تھا، چہل قدمی شروع کر دیتا۔ اُس میں چوکیداروں نے سبزیاں کاشت کر رکھی تھیں۔ وہ اُن کا رکوع کی حالت میں ہو کر اور اپنی لاٹھی کو سبزیوں کی جڑوں میں مار مار کر باریکی سے جائزہ لیتا پھرتا، مگر چوکیداروں سے بول چال کو راہ نہ دیتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا، یہ کون ہے؟ کلاس لیتے یا بچوں کو پڑھاتے مَیں نے اُسے نہیں دیکھا لیکن میرے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ سکول کے اُستاد اور لڑکے اُس کو اُستاد کے لقب سے ہی منسوب کرتے۔ پتا نہیں کیوں؟

اُن دنوں کلاسیں بھی گراؤنڈ میں لگتی تھیں، کھلے آسمان تلے۔ ایسا نہیں کہ کمرے نہیں تھے۔ بس استاد اور بچے گراؤنڈ کو ہی ترجیح دیتے۔ اِس کے باوجود کہ اُس کو مَیں نے کبھی پڑھاتے نہیں دیکھا، پھر بھی سکول سے ناغہ نہ کرتا۔ سو کنال رقبے کے سکول میں، وہ کبھی ایک کونے میں ہوتا، کبھی دوسرے میں۔ مَیں جب تک ایک نظر اُسے دیکھ نہ لیتا، طبیعت بے قرار رہتی۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ اُس کے پاس ایک انڈے کے برابر سفید رنگ کا موتی ہے اور اُس موتی میں ایک جن بند ہے۔ وہ جن اُسے لوگوں کے راز اور غیب کی باتیں بتاتا ہے اور گیت بھی سناتا ہے۔ اُس جن نے اِسے بہت سارا خزانہ بھی دیا تھا، جو اِس نے اپنے گھر میں گڑھا کھود کر چھپا رکھا ہے۔ یہ موتی وہ ایک ڈبیا میں چھپا کے دائیں جیب میں رکھتا ہے اور کسی کو نزدیک نہیں آنے دیتا، نہ خود کسی کے قریب جاتا ہے۔ کئی لڑکوں نے اُس کے بیٹوں سے موتی کے بارے میں پوچھا لیکن وہ بھی اتنا ہی بے خبر تھے جتنا عام لڑکے۔ اُن کا کہنا تھا، اُن کی والدہ نے اباجی کے برتن، کمرہ اور بستر الگ کر رکھا ہے اس لیے اُن کو اِس بارے میں زیادہ معلومات نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ اُس کے پاس بوسیدہ

کتابوں کا ایک ڈھیر ہے، جس میں عجیب و غریب نا سمجھ آنے والی باتیں درج ہیں۔ شاید سفید موتی اُن کتابوں میں چھپا کر رکھ دیا ہوا اور وہاں جا کر ہم نے نہیں دیکھا۔

میری شدید خواہش تھی، مَیں وہ موتی دیکھوں لیکن جن سے ڈرتا تھا۔ دو تین بار یہ ضرور ہوا کہ وہ کرسی چھوڑ کر جیسے ہی چہل قدمی کے لیے اُٹھا مَیں بھاگ کر کرسی کے پاس گیا مگر مجھے وہاں گھاس کے تنکوں کے سوا کوئی چیز نظر نہ آئی۔ کرسی کو ہلا کر اُس کے پایوں کے نیچے دیکھنے کی جرأت اس لیے نہ ہوئی، کہیں نیچے جن نہ بیٹھا ہو۔ اُس کے پاس جن کے موجود ہونے کی ایک اور دلیل بھی تھی کہ اُس سے سب سکول کے اُستاد ڈرتے تھے اور اُس کا نام آتے ہی با ادب ہو جاتے حالانکہ اتنا کمزور تھا کہ دس سال کا بچہ بھی اُسے چت کر لے۔ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا، چلتے ہوئے اکثر لڑکھڑا جاتا۔ سٹاف روم میں چائے بنتی تو چوکیدار اُس کے لیے بھی لے آتا، جسے وہ بغیر شکریے کے قبول کر لیتا۔

جس دن مَیں نے اُس کے پیچھے جا کر دیکھنے کی کوشش کی، یہ اُس سے دوسرے دن کی بات ہے۔ مَیں اپنی کلاس میں بیٹھا ریاضی کی ایک مشق کر رہا تھا کہ لنگڑا چوکیدار، جو اُسے چائے دے کر آیا تھا، نے میرا نام لیا اور کہا، منشی فضل حسین بلاتے ہیں۔ اُس وقت میری عمر محض آٹھ سال تھی۔ مَیں مردہ ٹانگوں کے ساتھ اُٹھ کر چوکیدار کے پیچھے چلنے لگا۔ بھاگنے کی طاقت اول تو تھی نہیں، دوم اُس کا جن مجھے ایک قدم نہ بھاگنے دیتا۔ چند لمحوں میں ہم وہاں جا پہنچے اور آج یہ پہلا دن تھا، جب مَیں اُس کے اتنا قریب کھڑا تھا کہ اُس سفید انڈے کے برابر موتی کی خوشبو لے سکتا تھا لیکن اب اُس کا خیال ڈر کی وجہ سے محو ہو گیا۔ چوکیدار جا چکا تھا۔ پچاس قدم کے دائرے میں اب نہ تو کوئی کلاس تھی، نہ لڑکا تھا، نہ اُستاد۔ فقط وہ تھا اور مَیں مجرموں کی طرح سامنے کھڑا تھا۔ مجھے اس بات کی حیرانی بالکل نہیں تھی کہ اُس نے میرا نام کیسے جانا، ظاہر ہے جن کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی۔

اُس کے چہرے کی بجائے وہاں باریک ہڈیاں تھیں لیکن اُن کے اُوپر جلد اتنی نرم اور سفید تھی کہ ہڈیاں بُری معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ ہاتھوں کی ناڑیں نیلی اور ماس کے نیچے کی تھیں ہڈیوں کو مزید واضح کر رہی تھیں۔ آنکھیں چمکدار تھیں مگر زیادہ ہی اندر کو دھنس چکی تھیں، جن پر سیاہ حلقے پڑے تھے۔ بال سر پر موجود تو تھے مگر اتنے کم کہ کنپٹیوں کی درزیں صاف دیکھ سکتا تھا۔ سر پر

دوپلی ٹوپی جما کر آتا لیکن وہ چلتے وقت ہی سر پر رکھتا تھا، جیسے ہی کُرسی پر بیٹھتا ٹوپی اُتار دیتا۔ مجھے اُس سے آنکھیں ملانے میں مشکل پیش آ رہی تھی اور مَیں مسلسل سکول کی دیوار کے ساتھ ساتھ پکی سڑک پر جاتے اُس چرواہے کو دیکھ رہا تھا، جو بے شمار بھیڑوں کو ہانکتا، نہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بھیڑوں کے گزرنے سے غبار اور بُو کی ہلکی لہر ہمارے ناکوں کو چھونے لگی۔ یہ بھیڑیں اور چرواہا اتنی خاموشی سے گزر رہے تھے جیسے ان کے قدموں کے نیچے روئی بندھی ہو۔ اُسی لمحے مَیں نے سوچا، یہ چرواہا کیسا آزاد ہے کہ اُسے منشی فضل نے اپنے سامنے حاضر نہیں کیا۔

بیٹے بیٹھ جاؤ

یہ آواز منشی فضل حسین کی بجائے کہیں غیب سے آئی تھی، جسے سُنتے ہی مَیں گھاس پر بیٹھ گیا اور پہلی دفعہ میری نظر نے اُس چھڑی کو غور سے دیکھا، جو کُرسی کے دائیں پائے سے سہارا دے کر کھڑی کی تھی۔ چھڑی کا قبضہ اتنا ملائم تھا کہ میرا جی چاہا، اُسے پکڑ کر دیکھوں اور اُس پر ہاتھ پھیروں مگر اس پر عمل کرنا ناممکن تھا۔ مَیں بیٹھ گیا اور اُس کی ٹانگوں کے درمیان، جو پتلون کے اندر صندل کی دو لاٹھیاں محسوس ہو رہی تھیں، سے جگہ بنا کر کُرسی کے چار پایوں کے درمیان دیکھنے لگا، جہاں خلا کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

کس درجے میں بیٹھتے ہو؟

اُستاد جی، تیسرے درجے میں ہوں، ماسٹر خالق صاحب پڑھاتے ہیں۔

کیا کچھ پڑھا؟

اس کا میرے پاس جواب نہیں تھا۔ مَیں ایک تنکے سے محض زمین کُریدنے لگا اور کچھ نہ بولا۔

تم جانتے ہو مَیں کون ہوں؟

مَیں اس بات پر بھی چُپ رہا اور انگلیوں سے گھاس کی جڑیں اُکھاڑنے لگا۔ مجھے یقین تھا کل والے واقعے کی وجہ سے بلایا ہے اور کچھ ہی لمحوں بعد اُس بات کی پُرسش ہونے والی ہے چنانچہ اُسی کا جواب سوچنے لگا۔

بیٹا آپ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ اچھا یہ بتاؤ، تمھیں کوئی شعر آتا ہے؟

جی اُستاد جی، آتا ہے۔ اُس کے لہجے کی ملائمت نے میرے اندر حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔

چلو کوئی شعر سناؤ۔

ہوئی شیر سے جب پسر کی لڑائی

سکندر کے بیٹے نے گولی چلائی

سکندر کا بیٹا کھڑا رہ گیا

لہو کا پیالہ بھرا رہ گیا

واہ، کمال کر دیا تو نے، یہ کس کے شعر ہیں؟ کہاں سے یاد کیے؟

اس بات کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور نہ یہ پتا تھا کب اور کیسے یاد ہو گئے اس لیے پھر چپ ہو رہا۔

اچھا کوئی اور سناؤ۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

شاباش، بہت ہی خوب۔ اچھا، اس شعر کا تو آپ کو پتا ہو گا، کس کا ہے؟

جی اُستاد جی، اب میں جلدی سے بولا، یہ مولوی عنایت کا شعر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مَیں نے سینکڑوں بار اُس کی زبان سے سُنا تھا، جب وہ جامع مسجد کے سپیکر پر چندہ مانگتے ہوئے ایک لمبی نعت پڑھتا تھا۔ اُس میں مجھے صرف یہ شعر ہی یاد رہ گیا تھا اور یہ کتنا اچھا ہوا کہ مَیں نے منشی کو صحیح صحیح جواب دے دیا۔

اچھا، میرے نزدیک آؤ۔

مَیں تھوڑا سا آگے ہو گیا۔ مَیں جانتا تھا، لڑکے دُور کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں اور میرے انجام کے بارے میں فیصلہ کن بات پر نہیں پہنچ پا رہے۔ سب کو یقین تھا، منشی فضل حسین کے دھن کے شکنجے میں پھنس چکا ہوں۔

اور نزدیک ہو جاؤ۔

مَیں اور نزدیک ہو گیا۔ اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کاندھے پر تھپکی دی۔ مَیں نے محسوس کیا، اُس کے ہاتھ کا وزن کاغذ سے زیادہ نہیں تھا۔ اس شفقت کے سبب میرے اندر پنپتا ہوا تجسس بے اختیار زبان پر آ گیا، اُستاد جی، لڑکے کہتے ہیں، آپ کے پاس انڈے برابر سفید

ہوتی ہے۔

ہاں بیٹا وہ ٹھیک کہتے ہیں، ماسٹر فضل حسین رواں آواز میں بولا، میرے پاس موتی ہے لیکن یہاں کوئی اُس کے دیکھنے کا اہل نہیں اس لیے اُس کو چھپا کے رکھتا ہوں۔ کل تم میرے پیچھے وہ موتی دیکھنے کے لیے کھڑے تھے؟

مَیں سر ہلا کر رہ گیا اور وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

اگر مَیں نے دکھایا اور تم لے کر بھاگ گئے؟

اللہ کی قسم نہیں لے کر بھاگتا، مَیں نے بچگانہ اصرار کے ساتھ کہا،

وہ ہنس دیا اور ٹوپی اُٹھا کر سر پر لے لی، جو اُس کی جھولی میں پڑی تھی، پاؤں میں جوتے اڑسنے لگا۔ یہ تیاری گویا اُس کے اُٹھنے اور کسی طرف جانے کی تھی۔

اچھا، ہم ایک کام کرتے ہیں، میرے ساتھ آؤ۔

لاٹھی، اُسے آپ عصا بھی کہہ سکتے ہیں، اُس کے ہاتھ میں تھی، جسے اُس وقت پکڑنے کی شدید خواہش مجھ میں پیدا ہوئی۔ پاؤں میں تنگی ریکسین کے جوتے تھے۔ اُن کے اندر پاؤں کے علاوہ مزید بھی جگہ تھی۔ مَیں اُس کے پیچھے چلنے لگا۔ مجھے کیا معلوم، وہ کدھر جا رہا تھا؟ لیکن یہ سفر اُسی سکول کے گراؤنڈ میں ہونے کے باوجود، جہاں مَیں روز دوڑتا تھا، آج ایک طلسماتی سا ہو گیا۔ میری نظریں اُس کی لاٹھی پر تھیں، جو بغیر آواز پیدا کیے، سیدھی آگے چلی جاتی تھی اور مَیں عادتاً اُس کے نشانوں پر پاؤں رکھتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ یہ میرے لیے ایک کھیل تھا۔ ہم نے ایک گراؤنڈ کو کراس کیا پھر دوسرے کو، پھر تیسرے کو۔ اُس کے بعد جنوبی سمت میں ایک دیوار کے ساتھ کھڑے آسمان قامت پیپل کے نیچے آ گئے، جس کی جڑیں دیوار میں اس طرح مکمل مل کے دُور تک نکل گئیں تھیں کہ دیوار کی بوسیدہ اینٹیں ٹوٹ ٹوٹ کر اُس کے تنے کا حصہ بن چکیں تھیں۔ بہت سی جڑیں زمین میں موٹی اور گول چوکیوں کی شکل میں اِدھر اُدھر اُبھری ہوئی تھیں۔ اِن کے نیچے بلیوں اور خرگوشوں نے اپنے ڈربے بنا رکھے تھے۔ شاخوں اور پتوں نے ایک دنیا کو گھیرا ہوا تھا۔ گراؤنڈ کا چوتھائی حصہ اِس کی لپیٹ میں تھا اور پرندے اِتنے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ یہی وہ پیپل تھا، جس کے بارے کسی کو شک نہیں تھا کہ اِس پر بھوت اور جن رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص دن کے بارہ بجے یا رات کے بارہ بجے اس کے تنے کے گرد سات چکر لگا کر جڑوں میں پیشاب کر دے تو اُسی وقت چڑیلیں اُس کی گردن توڑ دیتی

ہیں۔ چنانچہ ابھی تک کسی کو ایسا کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔
منشی فضل حسین نے مجھے ایک بھاری اور اُبھری ہوئی جڑ پر بیٹھنے کو کہا، جو ایک بڑی چوکی سی بن گئی تھی۔ میں اُس کی حکم عدولی کیے بغیر آرام سے بیٹھ گیا۔ لڑکے دُور جھرمٹ بنا کر دیکھ رہے تھے۔ مَیں کانپنے لگا کہ مجھے جنوں کو پکڑوانے کے لیے لے آیا۔ مَیں ایک ہی دم پسینے سے شرابور ہو گیا۔
اس جگہ کو پہچان لو۔ روزانہ مَیں تمھیں یہیں پر تین گھنٹے تک کچھ منتر پڑھاؤں گا۔ جب تک وہ منتر تم یاد نہیں کر لیتے، مَیں وہ سفید موتی تم کو نہیں دکھا سکتا۔ کیا تم کو منظور ہے؟ منشی فضل حسین نے لاٹھی سے اُس جڑ پر ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا،
سچ تو یہ تھا کہ ابھی مَیں موتی کو بھول کر اپنی جان چھڑانے کے چکروں میں تھا۔ کیا منتر یاد کرتا پھروں لیکن جنوں کا خوف مجھ پر اتنا سوار تھا کہ انکار کرنا میرے بس سے باہر تھا چنانچہ مَیں نے اوپر نیچے سر ہلا دیا۔
بس کل سے سکول کی کتابیں اور منتر سب کچھ یہیں دو گھنٹے تک تم کو پڑھاؤں گا۔ تم اپنی کلاس میں جانے کی بجائے یہیں آ جایا کرنا۔ اگر نہیں آؤ گے تو تمھارے پیچھے جن کو لگا دوں گا۔
اُس کے بعد حکم ہوا کہ اب گھر چلا جاؤں۔ میں اسی انتظار میں تھا، حکم ملتے ہی اُلٹے پاؤں بھاگا اور گھر آ گیا، جو سکول سے سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ گھر آ کر میں نے سارا واقعہ اپنی والدہ کو سنایا لیکن وہ بجائے پریشان ہونے کے ہنستی رہی۔ اُس نے کہا، بیٹا یہ استاد فضل حسین ہمارا پڑوسی اور تمھارے ابا کا گہرا دوست ہے، بڑا اچھا اُستاد ہے، تمھیں پڑھائے گا۔ تیرے ابا نے اس کی منت کی ہے۔ ماسٹر صاحب سے جی لگا کر سب کچھ سیکھنا۔
اب یہ دوسروں کو کیوں نہیں پڑھاتا؟ سارا دن خالی بیٹھا رہتا ہے۔
بیٹے جن نے اس پر سایا کیا ہوا ہے، جس کی وجہ سے وہ زیادہ دیر پڑھا نہیں سکتا۔
میری سمجھ میں والدہ کی باتیں نہیں آئیں لیکن چپ ہو گیا۔ دوسرے دن صبح آٹھ بجے بستہ لے کر سکول پہنچا اور ارادہ کیا کہ اپنی کلاس کی طرف جاؤں، اُسی لمحے اُس نے مجھے دیکھ لیا۔ پچیل سکول کے مرکزی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی جنوبی دیوار کے ساتھ تھا، جو سامنے ساٹھ ستر قدم پر موجود تھی۔ اُس کے اور گیٹ کے درمیان کوئی شے حائل نہیں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے لاٹھی ہلا دی چنانچہ میں اُس کی طرف چلا گیا۔

لے بیٹا، آج منتر کا پہلا سبق شروع کرتے ہیں لیکن پہلے ایک ایک سوال آپ کی درسی کتابوں کا ہو جائے، اُس نے میرے ہاتھ سے بستہ لے کر اُسے ٹٹولتے ہوئے کہا۔ مَیں نیچے اُسی جڑ کی چوکی پر بیٹھ گیا، جس پر کل بیٹھنے کو کہا گیا تھا۔ اس کے بعد ڈیڑھ گھنٹے تک اُس نے مجھے اس طرح درسی کتب پڑھائیں گویا باتیں ہو رہی ہیں۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ اُس نے کچھ پڑھایا تھا، ہاں جو باتیں کیں وہ سب یاد ہو گئیں۔ پھر اچانک کہا، اب آپ کو منتر سکھائیں گے اور دو چھوٹے سے قاعدے نکال لیے، جن کی زبان کچھ عجیب سی تھی لیکن اُس کو پڑھنے میں مزا آتا تھا۔ دو منتر وہیں بیٹھے بیٹھے یاد بھی کرا دیے۔ اُن کا نام اُس نے امیر خسرو کی پہیلیاں بتایا اور سختی سے منع کیا کہ کسی کو اس منتر کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بتاؤں ورنہ سارا اثر زائل ہو جائے گا، ایک اور بات کا دھیان رہے، جس دن یہ موتی مَیں نے تیرے حوالے کیا، اُس کے بعد زندہ نہیں رہوں گا۔ اس لیے پہلے تمام منتر سیکھ لو اُس کے بعد موتی لینا، کہیں کام ادھورا رہ جائے اور جن تم پر چڑھ دوڑے اس لیے جلدی نہیں کرنا۔ شیطان تمھیں بار بار بہکائے گا مگر تم اُس کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ باتیں جاری تھیں اتنے میں ایک طوطے نے اُوپر سے بیٹ پھینکی کہ اُستاد جی کی پوری ناک اور دامن کا کرتہ سُرخ رنگ کی بیٹ سے بھر گیا، جس کے اندر پیپل کی گولوں کے چھوٹے چھوٹے بیج صاف دلفریبی دکھا رہے تھے۔

او تیرا ستیاناس، نالائق جگہ بھی نہیں دیکھتے، ماسٹر فضل حسین نے ہش ہش کرتے ہوئے اُوپر کی طرف دیکھا۔

اُستاد جی آپ فکر نہ کریں، میں کل کو غلیل لے کر آؤں گا، ایک ایک کو تاک تاک کر ماروں گا، میں نے ماسٹر کی خوشامد کی اور ایک کچی مٹی کا ٹکڑا اُٹھا کر اُوپر پھینکا۔

نا بیٹا، اِن کو مارتے نہیں، یہ پرندے خدا کی اولاد ہیں، انھیں مارو گے تو خدا ناراض ہو گا اور وہ بھی تمھیں مارے گا۔

استاد جی خدا تو نہیں مارتا، مَیں نے پہلے بھی کئی بار انھیں غلیل سے مارا ہے۔

اچھا یہ بتاؤ، تمھیں کبھی بخار ہوا ہے؟

کئی بار، ایک دفعہ تو بے ہوش ہو گیا تھا۔

بس یہی خدا کی مار ہے، وہ تھپڑوں سے تھوڑی مارتا ہے؟ بلکہ کل سے تم ایک اور کام بھی

کرو۔ گھر سے روزانہ ایک روٹی اِن کے لیے لاؤ اور اس کے ٹکڑے کر کے ان کے آگے پھینکا کرو۔ ہم اِن کے گھر آ کر بیٹھے ہیں، اُس کا معاوضہ بھی تو اِن کو دینا ہے۔

استاد جی کی بات پر مَیں کھلکھلا کر ہنس دیا۔ یہ کوئی ان کا گھر تھوڑی ہے؟

تو اور کس کا گھر ہے؟ کبھی تم نے انسانوں کو درختوں پر رہتے دیکھا اور پرندوں نے بھی مکان بنائے؟

نہیں تو۔

اگر نہیں تو پھر میری بات پر ہنسنے کی کیا تک ہے؟ بھئی خدا نے درخت اِن پرندوں کے لیے ہی بنائے ہیں۔ یہ تو ان کی مہربانی ہے کہ ہمیں سائے میں بیٹھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اگر ہمارے سروں پر ٹھونگے مار مار کر نکال باہر کریں تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیں گے؟ انسان تو اتنا کم ظرف ہے، اِن درختوں کو سرے سے ہی کاٹ کر اپنا سایا اور ان کا گھر تباہ کر دیتا ہے۔

بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ واقعی استاد جی سچ کہتے تھے۔ ان کا ٹھونگا بہت بُرا ہوتا ہے۔ مجھے فوراً وہ واقعہ یاد آ گیا جب میرے سر کی بنڈ کو ابھی دو دن ہی ہوئے تھے اور میں باہر صحن میں کھڑا جلیبی کا ٹکڑا کھا رہا تھا تو ایک کوّے نے منڈ پر وہ زور کا ٹھونگا مارا کہ خون نکل آیا اور جلیبی ہاتھ سے گر گئی، جسے دوسرا کوا جلدی سے جھپٹ کر لے گیا تھا۔

مَیں نے کہا، اُستاد جی یہ کوّے بہت بُرے ہوتے ہیں، بہت سخت ٹھونگا مارتے ہیں۔

میری بات پر ماسٹر فضل حسین کی ہنسی نکل گئی۔ وہ بولا، اسی لیے تو میں کہتا ہوں، ہر ایک پرندے کا نام یاد کر کے اُن کو دوست بنالو۔

یہ میرے دوست کیسے بنیں گے؟ یہ تو ڈر کے اُڑ جاتے ہیں۔

جب تم اِن کو غلیل سے مارو گے تو کیا آ کر تمھارے گلے ملیں؟

اتنے میں تفریح کی گھنٹی بجی اور میں نے للچائی نظروں سے ماسٹر کی طرف دیکھا مگر اُس نے ایک اور کام کیا، اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا، میرے ساتھ آؤ۔ مجھے کیاریوں اور پھولوں کے پاس لے آیا اور ایک شاخ کو جھکا کر خوبصورت پھول کو میرے سامنے کیا، یہ کیا ہے؟

یہ پھول ہے، میں نے فوراً جواب دیا۔

اور اِس کی پتّیوں کے اندر کیا ہے؟

اب پھر میرا علمی سرمایہ ختم ہو گیا۔ پتیوں کے اندر کیا ہو سکتا تھا، کچھ بھی نہیں تھا، میں کیا جواب دیتا؟

میں نے مسکرا کر کہا، کچھ بھی تو نہیں ہے۔

کیوں کچھ نہیں ہے؟ اس کی پتیوں کے اندر جو نیلے پیلے اور گلابی ریشے نظر آتے ہیں، یہ اصل میں خدا کی روحیں ہیں اور جو ہلکی ہلکی خوشبو سونگھ رہے ہو، جسے تم دیکھ نہیں سکتے، یہ خدا ہے۔ یہی وجہ ہے، انسان جتنے زیادہ پھول اور درخت لگاتا ہے، اللہ اُس سے اتنا ہی خوش ہوتا ہے اور اُسے بڑے بڑے سفید موتی دیتا ہے۔

اس کے بعد وہ مجھے دیر تک ایک ایک پھول کی کہانی بتانے لگا، جن کے اندر جنوں اور پریوں کے مسکن تھے۔ اب مجھے یاد آیا کہ یہ جو بار بار پھولوں اور درختوں کی طرف دیکھتا رہتا تھا، دراصل یہی راز تھا۔ مجھے دوسرے لڑکوں پر ہنسی آئی، جن کو اس بات کا پتا نہیں چل سکا تھا کہ اصل میں ماسٹر فضل حسین کے ہاتھ یہ موتی اور جن کیسے لگا۔

تمام لڑکے کھیل چھوڑ کر ہمارے نزدیک آ گئے لیکن اتنا نزدیک بھی نہیں کہ ماسٹر کی باتیں سن سکیں بلکہ ایسے فاصلے پر، جہاں سے خطرہ بھانپتے ہی بھاگ سکیں۔

یہ وقت ایسے گزرا کہ مجھے پتا ہی نہ چلا، کب تفریح ختم ہوئی اور کب لڑکے اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔ میں اُس وقت چونکا جب منشی نے کہا، اب تم کو اجازت ہے، گھر چلے جاؤ اور میں گھر چلا آیا۔

اب کیا تھا، میں سب کچھ خوش خوش یاد کرنے لگا اور جی ہی جی میں انڈے برابر سفید موتی کے خواب دیکھنے لگا۔ پھر یہ خواب راتوں کو بھی آنے لگے۔ کئی بار ایسے ہوا، میں خواب میں موتی کو لیے چھپاتا اور بھاگتا پھر رہا ہوں لیکن نیند سے بیدار ہوتے ہی اپنے خالی ہاتھ دیکھ کر مایوس ہو جاتا۔ اسی عالم میں مجھ پر دن اور مہینے گزرنے لگے۔ پہیلیاں پڑھیں، کلیلہ و دمنہ پڑھی، بیتال پچیسی اور بیتال بتیسی حفظ کی۔ کچھ منتر جلدی یاد ہو جاتے تھے اور کچھ دیر میں۔ خاص کر جو شعروں میں تھے، وہ منٹوں میں حفظ ہو جایا کرتے۔ دن مہینے اور مہینوں نے چار سال کا منہ دیکھ لیا۔ پیپل کی جڑ، جس پر میں بیٹھتا تھا، وہ گھس کر ماسٹر فضل حسین کی لاٹھی کی طرح سفید، چمکدار اور ملائم ہو گئی۔ مجھے ایک ایک جڑ کا حلیہ اور نقشہ اتنا ازبر ہو گیا کہ ذرا سی تبدیلی کو فوراً بھانپ لیتا اور

پیپل کی شاخیں اور اُن پر پرندوں کے گھونسلوں کی تعداد تک یاد ہوگی۔ اب مجھے لاٹھی کی مٹھی کو بھی بلا اجازت چھونے میں جھجک نہ تھی اور میں کئی بار اُس کو پکڑ کے چلا بھی تھا۔

ہم دونوں شام کے وقت قصبے کے مضافات میں نکل جاتے۔ وہ آگے آگے میں پیچھے پیچھے۔ باغ، فصلیں، چرواہے، گائیں اور بھینسیں اور اُن کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیاں، کوئلوں اور فاختاؤں کے نغمے اور قصبے سے جنگلوں کی طرف شام کو اُڑ اُڑ کر جاتے ہوئے ہزاروں پرندے اور کھیتوں سے واپسی پر کسان بیلوں کی جوڑیاں ہنکاتے ہمارے رازداں تھے اور ہم اُن کے۔ پانچ سال گزر گئے۔

دن کیا، رات کیا، میں منتر پڑھتے تھکتا نہیں تھا۔ ایسی ہُوک لگی کہ بعض دفعہ ساری رات جاگتا اور جادو کے ملکوں کی سیریں کرتا۔ آنکھیں سُرخ ہو جاتیں۔ منتر ختم ہونے میں نہیں آتے تھے۔ الف لیلہ، امیر حمزہ کا عمرو عیار، سامری جادوگر اور قصہ چہار درویش، طوطا کہانی، قصہ حاتم طائی، مثنوی سحر البیان اور زہر عشق کے منتروں نے وہ رونق پیدا کی اور ایسے ایسے سفید موتی دکھا دیے کہ اُن کے آگے اُستاد جی کے موتی کی کچھ حیثیت نہ رہی۔ ان منتروں کے علاوہ درسی کتابوں میں بھی لڑکے تو ایک طرف، اُستادوں کے کان کاٹنے لگا۔ ہزاروں ہی شعر، تاریخی قصے، اور حکائتیں یوں زبان سے پھسلنے لگیں کہ سبحان اللہ۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اُستاد فضل حسین کی کھانسی اور خون کی تھوکیں بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ وہ لکڑی کی چھوٹی چھوٹی پٹیوں کی قینچی نما کرسی، جس کو تہہ بھی کیا جا سکتا تھا، پر اُسی طرح اکڑوں بیٹھا، مجھے میر اور انیس کی ساحری تک لے گیا۔

ایک دن جب ہم شام کو ٹہلتے ہوئے ذرا ٹیوب ویل کے کنویں تک پہنچے، جس کی نال سے ٹھنڈا پانی شرانے بھر بھر کر ایک حوض میں گر رہا تھا، اُس نے مجھ سے کہا، اب وہ موتی تمھارے حوالے کرنے کا وقت آگیا ہے، جس کا تم سے وعدہ کیا تھا۔ میں ہنس دیا کیونکہ اب جان چکا تھا کہ موتی کی حقیقت کیا تھی۔ اُس کے پاس کوئی موتی نہیں تھا۔ اُسی وقت اُسے ایک شدید کھانسی کا دورہ پڑا، جس میں بہت دیر تک ہلکان ہوتا رہا اور کھانسی کے ساتھ خون کے چھینٹے پھینکتا رہا۔ یہ ٹی بی کی آخری اسٹیج تھی۔ بڑی مشکل سے میں اُسے گھر تک لایا۔ جب اُس کی طبیعت سنبھلی تو اُس کی بیگم نے کہا، بیٹا اب تم چلے جاؤ۔ آپ کے اُستاد اب ٹھیک ہیں۔ میں گھر چلا آیا۔ اُسی رات وہ مر گیا۔ جنازہ ہوا اور پاس کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ دوسرے دن میں نے کہیں سے پیپل کا پودا

قبر کے سرھانے لگا کر اُسے پانی دے دیا۔
اُس کے بعد میرا دل اسکول میں نہیں لگا اور مَیں والد سے ضد کر کے دوسرے اسکول میں داخل ہو گیا لیکن چھٹی کے بعد اور شام کے قریب، جب ہر شے پُرسکون ہو چکی ہوتی اور میرے ہم عمر گراسی گراونڈ میں کھیل رہے ہوتے، مَیں اُس پیپل کے پاس جا کر بیٹھ جاتا اور ناغہ نہ کرتا۔ پرندوں کو روٹیاں ڈالتا اور اُن کے ساتھ مل کر نغمے گاتا۔ اُس ملائم اُبھری ہوئی جڑ پر بیٹھ کر کچھ منتروں کا ورد کرتا۔ اب میں خود بھی اتنا ہشیار ہو گیا کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ساحری کے خزینے اپنے پاس جمع کرنے لگا۔ مَیں چاہتا تھا، زیادہ نہیں تو اپنے قصبے میں کوئی مجھ سے بڑا جادوگر نہ ہو۔ موتیوں کا ایک بے بہا خزانہ میرے پاس اکٹھا ہو گیا، کہ اُس طرح کا ایک بھی میرے کسی کلاس فیلو کے پاس نہیں تھا۔ باغوں، کھلیانوں، ہواؤں، چرواہوں اور جانوروں کے گلے میں بجتی ہوئی گھنٹیوں اور ہلوں سے تلپٹ ہوتی زمینوں سے کیڑے مکوڑے جھینگی لالیوں سے اور ہوا میں قلا بازی کھاتے پرندوں سے میری دوستی پکی ہوتی گئی۔ مَیں خود منتر بنانے لگا، جو گائے بھی جا سکتے تھے اور پڑھے بھی جا سکتے تھے۔ یہ منتر پڑھتا پڑھتا مَیں دوسرے علاقے میں چلا گیا، جہاں مجھے اپنے دور کا سب سے بڑا جادوگر مان لیا گیا۔ اب وہ جن مکمل طور پر میرے قبضے میں تھا۔ زندگی کے اٹھائیس سال نکل گئے اور میں منجھا ہوا گھاک جادوگر ہو گیا۔ میرے پاس کئی نایاب موتی تھے، جو مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا تھا۔ ایک دن کافی عرصے بعد واپس اُسی قصبے میں آیا، جو اب شہر بن چکا تھا۔
بالکل وہی دن تھے، وہی موسم تھا، مَیں بھی وہی تھا، سکول بھی وہی تھا لیکن وہ پیپل نظر نہیں آرہا تھا۔ بالکل اسی جگہ پر تھا، جہاں دیو ہیکل بھدی عمارت کھڑی تھی اور اُس کی پیشانی پر انتہائی سیاہ عبارت میں پرنسپل ڈیپارٹمنٹ لکھا تھا۔ مَیں پیپل کی جڑوں کو بوسہ نہیں دے سکتا تھا، وہ میری دسترس سے باہر تھیں۔ پرندے غائب تھے، پھولوں کی کیاریوں کی جگہ پکی روشیں بن گئیں۔ سکول کے مضافات غائب ہو کر دور نکل گئے۔ چاروں طرف اُونچی اور بڑی دیوار تھی جس کے اُوپر لوہے کا جنگلا تھا، اُس کے باہر چرواہے اور بھیڑوں کی بجائے موٹروں اور رکشوں کی چنگاڑیں اور کثیف دھویں کے مرغولے تھے۔ باغوں اور کھلیانوں کو بجری اور لوہے کی عمارتیں کھا گئیں۔ لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ اور اُن کی پوشاکیں بدل چکی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں نوٹس کے بھاری رجسٹر تھے۔

اتنے بڑے سکول میں نہ کسی استاد کو پتا تھا، نہ پڑھنے والے کو، کہ یہاں کوئی اُستاد فضل حسین بھی تھا، جس کے پاس انڈے برابر سفید موتی تھا۔ نہ کسی کو پتا تھا کہ مَیں کون ہوں؟ اُستاد، طلبا اور سکول کے در و دیوار میں سے مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا، نہ مَیں کسی کو۔

مَیں دبے پاؤں وہاں سے نکلا، سیدھا قبرستان کا رُخ کیا اور اُستاد فضل حسین کی قبر پر جا پہنچا، قبر کے سرہانے کھڑا پیپل کا درخت اب تناور اور گھنا ہو چکا تھا۔ اُستاد فضل حسین کی قبر کے علاوہ اردگرد کی بیسیوں قبروں پر بھی اُس کی چھاؤں تھی اور شاخوں پر سینکڑوں پرندے چہک رہے تھے۔

دِلّی کا مرقع

احباب، زمانہ گزر جاتا ہے، تصویریں رہ جاتی ہیں۔ اگر ان تصویروں میں پہچانی ہوئی صورتوں کی نیک روحیں بستی ہوں تو کلیجہ کیسا کیسا خون ہوتا ہے، یہ بات کلیجے والے جانتے ہیں۔ دیکھ لو، یہ ہے وہ شہروں کا شہر، شاہجہان آباد، جس کا نقشہ سب سے پہلے مغلوں والے بادشاہ شہاب الدین کی آنکھوں میں تحریر ہوا اور اسی کے دل کے گوشے پر آباد بھی ہوا، پھر یہ ہماری آپ کی دلی ہو گئی، جس سے ہم مرزا اور میر، غالب کی نیک سیرتوں اور پیاری صورتوں کے سبب بہت واقف ہیں۔ یہی شاہ جہان آباد، جس کے گل پھول پر نغمے کہتے کئی بلبلیں دہر کے چمن سے اُڑ گئیں اور دلوں کے باغ ویران کر گئیں۔

اصل اس شہر کی کچھ اس طرح ہے کہ یہ علاقہ پہلے پہل ایک بھراپُرا جنگل تھا۔ جنوروں سے کھچا کھچ، پھول پتوں سے لدا پھندا۔ ہر وقت ہرے ہرے پانیوں کی پھیریاں رہتیں۔ روشن گھاس کے قطعے اور چکنے درختوں کی ڈالیاں لہلہاویں لے کر مسکراتیں اور بلبل و مینا ایک ہی ڈالی پر بیٹھ کر چہچہے لگاتیں۔ جس وقت جمنا بہاؤ پر ہوتی، یہاں آب حیات بہا کر گزر جاتی۔ اس سبب سارا جنگل کھلا کھلا رہتا، جہاں بن باسیوں کا بسیرا اور جوگیوں کا پھیرا ہوتا۔

صاحبقراں نے اس باغ و بہار خطے کو دیکھا تو آنکھوں میں خواب جاگنے لگے اور جی میں ایسا شہر بسانے کی آئی، جس کی مثال پورب پچھم کے پھیلتے جہانوں میں کسی نے نہ پائی۔ جو سمرقند و بخارا کی شہرت گرد میں ملا دے اور بغداد کے نام پر بل چلا دے۔ دُور دُور کے ہنر نصیب اور کاریگر جمع ہو کر شیراز و اصفہاں کی رونق کو فق کر دیں اور فرنگ کے ملکوں کا سینہ شق کر دیں۔ تاجر پیشہ دیس دیس کا مال یہاں لا کر پھیلا دیں اور اس شہر کو نگار خانہ، چین بنا دیں۔ یہ خیال جی

میں آتا تھا کہ بادشاہ سلامت نے جمنا کے پاٹ کو پچھواڑے رکھ کر لال قلعے کی فصیل کھینچ دی۔ فلک نشان دیوار پر بڑے بڑے بُرجوں کے پہاڑ رکھ کر فصیل کی ہیبت کو دو چند کیا اور چوڑے کنگروں اور اُونچے میناروں سے اس کو مزید رونق دی۔ جب یہ سب ہو چکا تو اس سُرخ قلعے کے سامنے کئی سینکڑے گز کھلا میدان چھوڑا، جس کے آگے شہر دلی کا نقشہ اس طرح جمایا کہ جمنا کی طرف قلعہ اور قلعے کے آگے شرقی غربی شہر کی چار کونی طشت رکھ دی اور نام اُس کا رکھا شاہجہان آباد۔

قلعے کی عمارت کا مختصر احوال اس طرح ہے کہ خاص محلات کی ایک قطار جمنا پڑوسن دیوار کی چھاتی پر جما کر دی اور اُن محلوں کے اندر پانچ ہاتھ چوڑی اور ایک ہاتھ گہری نہر بہا دی۔ نام اُس کا نہر بہشت رکھا، جو محلوں کے بیچوں بیچ سے ہو کر قلعے کے باغوں کا چکر بھرتی، پھر جھروکا کے سامنے والے مرمریں حوض میں جا گرتی، جہاں فوارے پھوٹتے اور اُن کے اندر مہتابیاں جگمگاتیں اور حوض کے پانی کو زرد رنگوں سے شرماتیں۔ اس نہر کا پانی دریائے جمنا سے قلعے کی بلندی پر چڑھ جانے کا بندوبست کچھ یوں تھا کہ دریا سے قلعے کی اُونچائی تک تانبے اور کانسی کی ٹینڈوں کی ایک مہال تھی، جسے قلعے کے اُوپر ایک بڑے چرخ کے ساتھ چلا دیا گیا تھا۔ اس چرخ کو چکر دینے کے واسطے چار بیل سارا دن جُتے رہتے، جو چرخ کو پھیرے دے دے کر مہال کو اُوپر کھینچتے اور پانی چرخ کے نیچے بنے حوض میں گر گر کر آگے نہر کی طرف چلا جاتا۔ دریا کا پانی گدلا ہوتا تھا اس لیے یہ نہر اُس پانی کو پاس ہی ایک چبوترے پر موجود کنویں میں گرا دیتی۔ یہاں اُس میں قلمی اور ابرق ملا کر پہلے اُسے شیشے کی طرح صاف اور ٹھنڈا کیا جاتا، اُس کے بعد اس نہر میں چلایا جاتا تھا، جو اُسے محلوں تک لے جاتی۔ محلوں کے اندر اور نہر کے اُوپر گاہ گاہ سنگ مرمر کے سفید تختے بچھے رہتے تھے۔ جن پر چاندی کی پلنگڑیاں اور صندل کے تخت لگے پڑے رہتے۔ ساری گرمیاں بیگمات، شہزادیاں اور بادشاہ سلامت انہی پلنگڑیوں پر چوکڑی مار کر بیٹھتے اور اس پانی کی شفاف نہر میں پاؤں رکھے آرام فرماتے اور زعفران کے شربت پی کر سینہ ٹھنڈا رکھتے۔

محل کے دائیں جانب جمنا کی طرف سنگ مرمر کی جالیاں اور جھروکے تھے۔ جن کے اُوپر شہزادوں کے سفید کبوتر محل کے جھروکوں سے جمنا اور جمنا سے جھروکوں تک پھریریاں لے لے کر اُڑاریاں بھرتے اور ہم مزاجوں کو سبز باغوں کے سفید پھول دکھاتے۔ انہی جھروکوں سے جمنا کی ہوائیں چھن چھن کر اندر آتیں اور محل کو ہر وقت سردیوں کی طرح ٹھنڈا رکھتیں۔ جاڑے کے

دنوں میں نہر بہشت بند کر دی جاتی اور اس میں پانی کی جگہ پارے کے بڑے بڑے طشت رکھے جاتے تھے، جن کے بیچ لوبان اور کستوری کے جو ہر دہکا کر پڑے رہتے اور شراب کے شیشے بھی سونے چاندی کے ورقوں میں یہیں لگے سجتے۔ اسی خواب گاہ کے ساتھ ایک بڑا مسقف دالان تھا۔ جہاں بادشاہ سلامت حرم، شہزادے اور شہزادیوں کے ساتھ مل کر خاصہ تناول فرماتے اور نذریں وصول کرتے۔ اسی نہر والے محل میں ہی جہاں پناہ خاص خاص لوگوں سے اور شہزادوں کے ساتھ ملاقات فرماتے تھے۔ جیسے مرزا فخرو، حکیم احسن اللہ خان یا استاد ذوق۔ بعد میں کچھ دنوں کے لیے مرزا نوشہ نے بھی یہاں کی حاضری دی اور بادشاہ کی اقبال مندی کا قصیدہ کہا۔

اس نہر کے علاوہ ایک اور نہر تھی۔ چاندنی چوک بازار میں بہنے والی اس نہر کو سب سے پہلے شہاب الدین محمد شاہجہاں سفیدون تک صاف کرا کے پہلے قلعہ شاہجہاں تک لایا، جب لال قلعہ بن چکا تو نہر کو آگے چاندنی چوک بازار میں جاری کر دیا۔ یہ نہر جمنا سے قلعے کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ گھسیٹ کر شمال کی طرف سے شہر میں داخل کی گئی تھی اور پاٹ سے لے کر کناروں تک سراسر سرخ پتھروں سے بنی تھی۔ حقیقت میں شاہجہاں آباد کا وجود اسی نہر کے پانی سے گندھ کر تیار ہوا تھا، جس کی مٹی میں وہ وہ سورج اور ماہتاب تارے دفن ہیں کہ ان کی نور سے ہمارے آپ کے دلوں کے چراغ منور ہیں۔ یہ دوسری نہر شہر میں داخل کر کے اور لال قلعے کے سامنے سے گزار کر چاندنی چوک کے بازار میں بہادی گئی۔ یہ وہی چاندنی چوک کا بازار ہے، جس کو شاہجہاں بادشاہ کی بیٹی جہاں آرا بیگم نے بنوایا۔ کیفیت اس بازار کی یہ ہے کہ قلعہ کے سامنے چار سو اسی گز کا میدان چھوڑ کر شہر کے حدود شروع ہونے سے پہلے اسی گز قطر کا ایک چوک ہے، جہاں بے شمار شہتوتوں کے نیچے ہری چھاؤں کے ساتھ میٹھی اور لمبی گولوں کو بکھیرتے۔ یہیں جھنڈ کے جھنڈ لگے پیلوں کی چھاؤں میں شہر کے اُمرا کی سواریاں جھولتیں، شُرفا کی پالکیاں اُٹھتیں، عوام الناس کی اُونٹ گاڑیاں چلتیں اور پیدل چلنے والوں کی چہل پہل رہتی۔ شربت بیچنے والوں کی چوکیاں، مُرغ اور بٹیر لڑانے والوں کی پالیاں بھی اسی چوک میں جمتیں۔ پُتلی تماشے، بانک اور بنوٹ کے کھیل بھی یہیں لگائے جاتے یا پھر کبھی کبھی جامع مسجد کے سامنے اکھاڑے لگتے۔ نقارچی اور دمامے پیٹنے والے اپنے دماموں اور نقاروں کی اوٹ میں یہیں بیٹھتے۔ اسی چوک میں میلاد النبی اور محرم کے جلوس نکلتے اور امام کے ماتم داروں اور زنجیر زنوں کے حلقے جمتے۔ یہی وہ

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

چوک تھا، جس کے ایک کونے پر برگد کا درخت تھا۔ اُس کی چھاؤں میں میر صاحب اکثر آرام فرمایا کرتے تھے اور یہیں بیٹھے بیٹھے جہان آباد کے بلوریں لونڈوں، آتے جاتے ترک امردوں اور سبزہ رنگوں کی زیارت کرلیا کرتے اور جی بہلالیا کرتے تھے اور یہ بھی سنا ہے، جب وہ خود بھی خوش رو تھے اور باپ کے مرنے کے بعد ورثے میں ملی ہوئی کتابوں کی درستی کر کے بیچتے تھے، وہ بھی یہی جگہ تھی کہ قلعہ کے سامنے اور اُمرا کے آنے جانے کے راستے پر یہ اچھا ٹھکانا تھا۔ وہ برگد کا درخت اب بھی وہاں موجود ہے۔

چوک میں کوتوالی چبوترہ بھی تھا۔ اس سے چار سو گز آگے ایک اور ہشت پہلو چوک تھا، جسے چاندنی چوک کہتے ہیں۔ یہیں پر بیرم خاں کا وہ ترا ہا ہے، جس کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی مسجد تھی، اسے سنہری مسجد کہا جاتا تھا۔ اسی ترا ہے کے درمیان کھڑے ہو کر نادر شاہ نے دہلی کی عوام کے قتل کا حکم صادر فرمایا تھا۔ اس چوک کے گرد بہت خوبصورت دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ بیرم خاں کے ترا ہے سے شمال کی طرف ایک باغ تھا، جس کو صاحب آباد یا بیگم کا باغ کہتے تھے۔ اس کے آگے چار سو ساٹھ گز لمبا بازار ہے اور درمیان میں یہی نہر بہتی تھی جو آگے فتح پوری مسجد تک جاتی تھی۔ یہ وہی مسجد ہے، جس کے بارے میں مرزا غالب نے کہا تھا، امراو بیگم نے گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا رکھا ہے۔ یہ بازار ہی دلی کا مرکزی بازار تھا، جو فتح پوری مسجد تک پورے کا پورا چھوٹے چھوٹے سرخ پتھروں سے چارپائی کی طرح بُن کر شاہی سواری کے لیے بنایا گیا تھا تا کہ سواری کے گزرتے ہوئے مٹی کے ذرے نہ اُڑیں اور عوام بازار کے گرد دو رویہ کھڑے ہو کر بادشاہ سلامت کی سواری کا نظارا کر سکیں اور اس کی زندگی اور بادشاہت کو دعا دے سکیں۔ سرخ پتھروں کو ٹھنڈا رکھنے کے واسطے کئی کئی ماشکی نہر سے مشکیزے بھر بھر کر سڑک پر چھڑکاؤ کیا کرتے اور شام ہوتے ہی پورے بازار میں لالٹینیں جگمگا اٹھتیں، جن کے سائے سائے ترک اور ایرانی پریزاد ٹہلا کرتے تھے۔ چاندنی چوک سے تھوڑا پہلے روک کر اُس میں سے بائیں ہاتھ کی طرف ایک چھوٹا بازار اور بھی نکال دیا گیا تھا، جو جامع مسجد کے شمالی دروازے کو سلام کر کے وہیں رک جاتا تھا۔ وہ بازار وہاں آج بھی ہے۔ بائیں ہاتھ جامع مسجد صاف نظر آتی ہے۔ جامع مسجد سب کی سب سرخ پتھر سے بنائی گئی تھی اور اس کا صحن ایک پوری بستی کے برابر رکھا گیا تھا۔ پہلے یہاں ایک مٹی کی چھوٹی پہاڑی تھی، جس پر یہ مسجد بنائی گئی۔ اس کے گنبد اور مینار ایک زمانے تک دنیا والوں کو

شاہجہان آباد میں منادی کر کر کے بلاتے رہے۔
چاندنی چوک بازار کی نہر ڈیڑھ ہاتھ گہری اور چھ ہاتھ چوڑی ہوتی تھی اور اس کے گرد دورویہ گھنے سایہ دار درخت تھے۔ بعد میں نہر کم زیادہ ہوتی رہی اور درخت کٹتے اور لگتے رہے۔ اس شہر کی زیادہ عمارتیں پتھر ہی کی تھیں اور خاص چاندنی چوک بازار کے ساتھ ساتھ جو مکانات تھے، وہ سب کے سب بھی پتھر کے اور سفید رنگ کے تھے، جن میں ایرانی اور تُرک اُمراء بستے تھے۔ کسی دوسرے کو اس شاہی بازار میں سکونت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ عام لوگ دوسرے اور چھوٹے کوچوں میں رہتے تھے اور سوائے ہاتھی اور گھوڑے کے، دوسری سواری اس چاندنی چوک والے بازار میں نہیں چل سکتی تھی۔ ہاں پیدل کی اور بات تھی۔ پورے شہر میں پیپل، برگد، نیم، شہتوت اور بیریوں کے بے شمار درخت تھے، جن کے درمیان شہر کی عمارتیں چھپی چھپی تھیں۔ شہر میں ہزاروں تکیے اور شہتوتوں کے باغ بھی تھے، جن میں بھنگ پینے والے اور درویش ہر وقت بسیرا کیے بیٹھے رہتے۔ اکثر علما، شاعر اور درباری پہلے پہل اسی بازار کی زینت بنے۔ بعد میں جب زمانہ آگے پھیلتا گیا تو یہ لوگ بھی پورے شہر میں پھیلتے گئے۔ پھر تو دلی کے سب کوچے اسی طرح کے ہو گئے تھے، دوستو ہمارے، آپ کے میر صاحب یوں ہی تو نہیں فرما گئے تھے،

دلی کے نہ تھے کوچے، اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

لو دیکھ لو، سرخ پتھروں سے جڑی ہوئی عمارتوں کے ساتھ ساتھ جامع مسجد دہلی، مسجد فتح پوری، کئی سو حویلیاں، کٹڑے اور سرائیں شامل تھیں، جو آج آپ اور ہم ان تصویروں میں تو دیکھ سکتے ہیں اور خواب کے قدموں سے اس کے کوچوں میں چل پھر سکتے ہیں لیکن مادی جسموں سے ان میں چلنے پھرنے کی ہمیں نہ اجازت ہے اور نہ ہی قدرت، کہ وہ زمانہ اُن کا تھا ہمارا نہیں۔ اس لیے اب ان کوچوں کو نہ تلاش کیجیے کہ آپ کو نہ تو اب یہ دلی ملے گی اور نہ یہ اوراق مصور والے میر صاحب کے کوچے۔ ہاں ایک رات مَیں نے خواب کی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک دفعہ میر صاحب راجہ جگل کشور کی مصاحبت میں بہت دن دلی سے باہر رہے تھے اور ابھی ابھی شہر میں پھرے تھے۔ اسی عالم میں بیرم خاں کے ترابے سے ذرا پہلے چاندنی چوک بازار کی طرف سے پیپلوں کے سائے سائے جامع مسجد کو جا نکلے، وہیں چند لمحے مسجد کے پہلو میں سرمد کی قبر کی سہارا لے کر بیٹھے، اپنے اور

اُس کے حق میں دعا کی، کچھ شعر گنگنائے اور اُٹھ گئے۔ اب کیا تھا، شہر میں پل کی پل دُھوم لگ گئی کہ میر صاحب دلی لوٹ آئے ہیں اور ابھی نجف خاں کی حویلی کی طرف گئے ہیں۔ اس خدائی آواز ے کا بلند ہونا تھا کہ شاہجہان آباد میں ایک جشن دوڑا۔ آفتاب نیزہ تک یہ خبر بستی نظام الدین، مہرولی، کوٹلہ فیروز اور تغلق آباد تک اُڑ گئی۔ تھوے اور قفلی والوں کی سرائیں ترنگ میں آ گئیں۔ شُرفائے شہر سے لے کر شہدوں تک کی زبانیں موزوں ہونے لگیں۔ سب شاعر، بانکے اور سخن ور چلے میر صاحب کی طرف اُن کی زیارت کرنے۔ کچھ ہی دیر میں، یقین، فغاں، ضیا، قائم، سوز، حسن، مرزا مظہر، غرض کس کس کا نام لوں، سب گرد جمع ہو گئے۔ اِتنے میں مرزا رفیع کو بھی اطلاع ہوئی، وہ اگر چہ خود بھی آگ کا مزاج رکھتے تھے اور میر صاحب سے کسی طرح بھی کم نہیں تھے، علاوہ ان باتوں کے، سال خوردہ بھی تھے لیکن سخن میں منصفی کا پیشہ کرتے تھے اور میر کے مرتبے سے واقف تھے، چنانچہ اُن کی آمد کی خبر اُٹھتے ہی ملازم غنچہ کو معہ قلم دان ساتھ لیا اور ملنے کو چلے۔ سپاہی زادے تھے، اس وجہ سے بجائے ہاتھی یا پالکی کے، گھوڑے پر سوار ہوئے گئے، خود گھوڑے پر بیٹھے چلے جاتے تھے اور غنچہ قلم دان لیے، گھوڑے کے پیچھے بھاگتا جاتا تھا، جوان لڑکا تھا ورنہ اس گرمی میں کچومر نکل جاتا۔ اُن دنوں مہینہ ہاڑ کا تھا اور دھوپ اور گرمی کے غبار دلی کے سر پر چڑھے تھے۔ زبان سے حلق کی راہ سانس میں خشک ہو جاتی تھی، چنانچہ چاندنی چوک میں تھوڑی دیر کو رُک کر نہر سے اپنے گھوڑے کو پانی پلایا، جو چاندنی چوک بازار کے بیچوں بیچ ہر وقت بہتی تھی اور اُسی نہر سے سب دہلی والے اپنے جانوروں کو بھی پانی پلاتے تھے اور خود بھی پیتے تھے۔ مرزا صاحب پیپل کی چھاؤں کی زمین لے کر رُکے، وہیں ایک عطار کے اصرار پر اُس کی دوکان کی چوکی کی سہارے کر راحت لی اور صندل کے شربت کا کٹورہ پیا۔ پاس عطار کا لونڈا مروارید اور گاؤزبان کو ملا کر کونڈے میں پھینک رہا تھا، عطار نے حکم دیا، بیٹا ذری مرزا صاحب کے پنکھے دبا دو۔ لڑکے نے والد کی بات پر کونڈا وہیں رکھا اور مرزا کے کاندھے دبانے لگا۔ غنچہ بھی پاس کھڑا دیکھتا تھا، عطار نے ایک کٹورا شربت کا اُسے بھی پینے کو دیا۔ دو پل کے بعد مرزا نے لڑکے کو تحسین کی اور کہا، بس میاں، خدا جوانی کا بھلا کرے اور دس کوڑیاں عطار کے ہاتھ تھما دیں۔ پھر اُٹھے، پیش قبض کو درست کیا اور آگے چلنے کو تیار ہو گئے۔ باگ کو ہاتھ میں لے کر اور رکاب میں پاؤں دے کر ابھی گھوڑے پر بیٹھنے ہی لگے تھے، اِدھر سے میر درد کی سواری کو آتے دیکھا کہ ارد گرد دو پلی ٹوپیاں سروں پر رکھے، مریدوں کے پرے جتے چلے

آتے تھے۔ پالکی کی سواری پاس آ کر رُک گئی۔ سلام دعا ہوئی۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب بولے، حضرت آج خانقاہ سے کیسے قدم باہر نکالا، پھر ہنس کر کہا، خیر سے زندوں کے جنازے چلنا سنا تھا، دیکھا آج ہے۔ یہ ساتھ کفن پہنے، جنتی فرشتوں کا غول بیابانی اور ہم رکاب گنہگاروں کی شیبائے شیطانی لیے، کس برزخ کی طرف کوچ ہے؟ یا ذکرِ ہو سے نئے محلے تاراج کرنے کی سوچ ہے۔ میر درد سودا کے ساتھ غنچے کو مد قلم دان دیکھ رہے تھے اور اُن کے آتشیں مزاج سے واقف خوب تھے اور ہجو کی تیغ تیز سے مرعوب تھے اس لیے تیوری چڑھا کر آگ ہونے کی بجائے ہنس دیے اور بولے، مرزا صاحب، ہم کہاں کے زندہ ہیں، چار پہر کے لیے دنیا دیکھنے آئے ہیں، دیکھ کر چلے جائیں گے۔ یہ سُن کر سودا نے ایک نوکیلا جملہ اور پھینکا، حضور ایسا نہ کہیے، دنیا سے آپ کو ایسا بھی بے نیازی کا علاقہ نہیں، یوں کہیے، تصوف کے حجاب میں خانقاہ کے لونڈے تاکنے آئے ہو۔ مرزا کی بات سُن کر میر درد ایک دم جھینپ ہی تو گئے، بولے مرزا صاحب، آہستہ، مریدین کے حلقے میں کھڑے ہیں۔ خیر آپ سنایئے، ہم تو ابھی میر محمد تقی کو دیکھنے چلے ہیں، سنا ہے کل ہی تشریف لائے ہیں اور نجف خاں کی حویلی میں اُترے ہیں۔ آہ بھر کر، اُن کا اپنا مکان تو کب کا زمانے کی خرابی سے برباد ہو چکا۔ اب اپنی ہی دلّی میں مہمان بن کے ٹھکانا کرتے ہیں۔ مرزا نے کہا، چلیے میرا بھی رخ اُدھر ہی کا ہے۔ چونکہ گھوڑے پر تھے، اس لیے درد سے پہلے پہنچے۔ میر صاحب، ڈیوڑھی میں بیٹھے پیچوان کا دھواں اُٹھا رہے تھے۔ پیچوان کی نے کے دہانے پر چاندی کی نقش شدہ پتری چڑھی تھی اور پانی کا تو نہ کوئی گھڑے بھر کا ہوگا۔ پاس آٹھ دس مونڈھے پڑے تھے اور اُس سے آگے سفید چاندنی کا فرش بچھا تھا۔ میر صاحب اُس وقت سفید ململ کے لباس میں اچھے خاصے لگ رہے تھے۔ آٹھ بَر کا کُرتا اور اتنی ہی پھیلاؤ کی چادر تھی۔ سر پر دوپلی ٹوپی، جس کا اگلا کونہ ماتھے کی طرف جھکا ہوا اور پاؤں میں کان پوری چمڑے کے نرم جوتے تھے۔ ایک ہاتھ میں سبز ریشم کی جریب تھی۔ ڈیوڑھی میں کچھ اور لوگ بھی تھے، یہ دلی کے اُمرا اور سخن پیشہ احباب تھے، جو میر صاحب کے ادب میں بالکل ساکت اور خموش تھے، گویا سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ نجف خاں خود تو موجود نہ تھے مگر اُس کے ملازم مہمانوں کی شربت سے تواضع کر رہے تھے۔ سب کو یہی توقع تھی کہ حضرت آج کچھ نہ کچھ ارشاد فرماویں گے اور وہ اُن کی نئی غزل کے موتی جھولیوں میں ڈال لے جاویں گے مگر اِدھر لب تک نہیں ہل رہے تھے۔ اتنے میں مرزا رفیع سودا آ گئے۔ اُن کے گھوڑے کی باگ فوراً ایک نوکر نے بڑھ کر پکڑ لی اور

حویلی کے پہلو کے تھان میں لے گیا۔ مرزا صاحب کو دیکھتے ہی میر صاحب پہلی بار اپنی نشست سے اُٹھے اور مرزا کو گلے لگایا۔ احباب نے اس بات کو نیک شگون جانا اور مرزا کی آمد کو مبارک قدم سمجھا۔ بارے حال احوال کے بعد گفتگو چلی اور بہت باتیں ہوئیں لیکن میر صاحب حسب معمول کم کم ہی بولے۔ ابھی یہاں باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خواجہ میر درد آن پہنچے۔ اُن کی درویشی کا رُعب میر صاحب پر تو خیر کیا جمتا البتہ بیٹھے ہوئے احباب تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے اور آداب و تسلیمات کے بعد اپنی اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ اب ڈیوڑھی میں کوئی جگہ خالی نہیں بچی تھی۔ مرزا اور درد بھی موجود تھے، اس لیے ہو نہیں سکتا تھا کہ میر صاحب کو اب بغیر غزل سُنائے بنتی۔ کوئی پہر بھر کی ملاقات اور مصائب سفر کے بیان کے بعد میر صاحب ایک غزل سُنانے پر راضی ہو ہی گئے۔ غزل بھی بالکل نئی کہی تھی۔ اِدھر اُنھوں نے پیچوان کی نے ایک طرف کی، اُدھر سب لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میر صاحب گویا ہوئے، صاحبو کیا کہوں، زمانے نے جو میر عبدالحی تاباں کی جدائی کا داغ دیا، کئی دن سے اُسی کی روشنی میں آنکھیں جاگ رہی ہیں اور اِسی تازہ زخم نے ایک غزل کہلوائی ہے، آپ بھی سُن لیجیے۔ پھر یہ غزل پڑھنا شروع کی۔

کئی دن سلوک وداع کا مرے در پئے دلِ زار تھا
کبھو درد تھا، کبھو داغ تھا، کبھو زخم تھا، کبھو وار تھا

دمِ صبح بزمِ خوش جہاں، شبِ غم سے کم نہ تھے مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا، جو پتنگ تھا سو غبار تھا

دلِ خستہ جو لہو ہو گیا، تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا، کبھو دردو غم سے فگار تھا

دلِ مضطرب سے گزر گئی، شبِ وصل اپنی ہی فکر میں
نہ دماغ تھا، نہ فراغ تھا، نہ شکیب تھا، نہ قرار تھا

جو نگاہ کی بھی پلک اُٹھا تو ہمارے دل سے لہو بہا
کہ وہیں وہ ناوکِ بے خطا، کسو کے کلیجے کے پار تھا

یہ تمھاری اِن دنوں دوستاں مژہ جس کے غم میں ہے خوں چکاں
وہی آفتِ دلِ عاشقاں کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

نہیں تازہ دل کی شگفتگی، یہی درد تھا، یہی خستگی
اُسے جب سے شوقِ شکار تھا، اِسے زخم سے سروکار تھا
کبھو جائے گی جو اُدھر صبا تو یہ کہیو اُس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرِ شکستہ پا، ترے باغِ تازہ میں خار تھا

غزل کا حرف حرف بتا رہا تھا، میر صاحب تاباں کے غم میں گھلے بیٹھے ہیں۔ ایسی بے پناہ رقت کہ سب ہی ایک دم آبدیدہ ہو گئے، کسی کو واہ کہنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ کچھ لمحوں کے لیے وقت کو بھی چپ لگ گئی تھی۔ ابھی یہاں تو یہ صورت تھی کہ اُسی وقت بیرم خاں کے تراہے کی طرف سے نقارہ بجنے کی آواز گونجی، غالباً بادشاہ کی سواری نکلی تھی۔ خدا جانے یہ کس طرز کا نقارہ تھا کہ اسی کے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ ہائے کیا اچھا خواب تھا، کاش یہ بادشاہی نقارہ نہ بجتا اور میں وہیں رہ جاتا۔

خیر میاں، شاہجہان آباد کے شمال مغرب کی فصیل کے ساتھ ساتھ بھی ایک نہر جاتی تھی، جو مضافات سے ہوتی ہوئی مہرولی میں جا نکلتی۔ یہ نہر سنا ہے، سلطان التمش نے شاہی باغات کو سیراب کرنے اور حشمی تالاب کو بھرنے کے لیے جاری کروائی تھی۔ آس پڑوس کے جاٹ اور زمیندار گاہے گاہے اس کا پانی چرا کر فصلوں کو لگا لیتے، پھر بادشاہ کی طرف سے سزا پاتے۔ اسی مہرولی میں آپ لوہے کی لاٹھ اور قطب کا مینار دیکھ سکتے ہو۔ وقت نے ابھی اِن چیزوں کے دیکھنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ یہ وہی نہر ہے، جس کا ذکر (پھول والوں کی سیر) میں ہوا ہے۔ مہرولی میں پھسلن پتھر، جھرنے، آموں کے شاہی باغ اور حشمی تالاب اِسی نہر کی دین تھے۔ غالب نے اسی آموں کے باغ سے آم کھانے کا لطیفہ گھڑا تھا۔

شاہجہان آباد کے جنوب مشرق میں ایک کھنڈر ہے، یہ تغلق آباد ہے۔ اس سے تھوڑا آگے جنوب مغرب کی طرف جایئے تو بستی نظام الدین میں جا نکلو گے۔ وہاں ایک درویش کی سرا ہے، جہاں سے کبھی امیر خسرو کی پہیلیاں، دوہے اور کہہ مکرنیاں نکل نکل کر مہرولی کے گھروں گھروں پھرتی تھیں۔ لو بھائی اب میں جاتا ہوں۔ بس یہ بتا دوں کہ اب اِن سب جگہوں پر کوئی نہر نہیں ہے، نہ باغ ہیں، نہ جھرنے اور نہ پھسلن پتھر۔ بس ایک جمنا رہ گئی، اور اُس میں بھی روزانہ تین ہزار مُردوں کی راکھ بہتی ہے، گویا پانی کی بجائے جمنا کے پاٹ میں شمشان گھاٹ بہتے ہیں، کچھ نہیں بچا۔

رہے نام اللہ کا

سیاہ ٹھپا

جیل کی چار دیواری کے مضافات میں بھی جیل کی زمین ہے۔ یہاں سارا دن وہ قیدی، جن کی قید چند ماہ رہ جانے کی وجہ سے اُن کے بھاگ جانے کا اندیشہ صفر ہو، یا جو سال ہا سال سے جیل کو اپنی ملکیت سمجھے بیٹھے ہوں، آپ انھیں ان مضافات میں کام کرتے دیکھ سکتے ہیں۔ بظاہر یہ بے ضرر قیدی جیل افسران کے نجی کام کرتے نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں جیل کے اندر اور باہر کے درمیان ایسا رابطہ ہیں، جو منشیات اور پیغامات کی منتقلی کا کام دیتے ہیں۔ میں نے گاڑی جیل کی مضافاتی دیوار کے پاس روکی اور پیدل دیوار کا گیٹ عبور کر کے، جس کا ایک حصہ کبھی کا ٹوٹ چکا تھا، ایک کچی راہداری پر چل دیا، جو بارش کے دنوں میں یقیناً کیچڑ سے بھر جاتی ہوگی لیکن اس وقت وہ گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ یہ بڑی پگڈنڈی نما کچی سڑک جیل کے مرکزی گیٹ تک چلی گئی تھی۔ سامنے گھاس کے میدان میں کٹی ہوئی ٹاہلیوں کے موٹے تنے بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ ان کے نیچے سے کھردری گھاس کی جڑیں دور تک پھیلی تھیں اور تنوں کے موٹے چھلکوں کو پھاڑ کر اندر گھس رہی تھیں۔ ان کے اردگرد بھی گھاس اتنی اونچی اور گھنی تھی کہ موٹے اور بھاری تنے اُس میں چھپے ہوئے تھے۔ ان سے کچھ فاصلہ آگے جا کر لہسن، پیاز اور سبزیوں کی کیاریاں نظر آ رہی تھیں اور جامنوں کے دو اونچے پیڑ بھی تھے، جن کے پتے پانی کی کمی کے باعث پیلاہٹ میں تبدیل ہو رہے تھے۔ کیاریوں میں کام کرنے والے قیدیوں کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں، جن کی وجہ سے اُن کے پاؤں میں سیاہ گٹے پڑ چکے تھے۔ کچھ فاصلے پر مکئی اور جوار کی فصلوں میں گائے، بھینسیں چر رہی تھیں۔ ان کے چرواہے بھی وہی قیدی تھے۔ کئی ٹنڈ منڈ پیڑوں کی چوبوں پر گدھیں بیٹھی آرام کر رہی تھیں۔

کچھ دیر میں مَیں جیل کے مرکزی دروازے پر پہنچ گیا، جو بڑے بڑے بدمعاشوں کو نگل چکا تھا۔ دروازے کے دائیں پٹ میں ایک چھوٹی مگر مضبوط لوہے کی کھڑکی تھی، جس میں پیدل قیدیوں کو دھکے مار کر اندر کیا جاتا ہے۔قیدی احتیاط سے کام نہ لے تو اُس کا سر بُری طرح سے ٹکرا جانے کا خطرہ بھی ہے۔دروازے کے دائیں طرف سینکڑوں ملاقاتی سامان کے ساتھ دُور تک بیٹھے تھے۔

میرے پاس اُس قیدی کے لیے کچھ سامان تھا۔دودھ، بسکٹ، ڈبل روٹی اور اسی طرح روز مرہ استعمال کی چیزیں۔ بیگ کافی بھاری تھا۔مَیں بھی ملاقاتیوں میں شامل ہو گیا، جو میرے آنے سے پہلے لمبی قطار بنائے کھڑے تھے۔ مجھے اُن کے وہاں پہلے آ جانے پر شدید کوفت ہوئی لیکن اس کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں دو کیبن تھے، جن میں دو پولیس والوں پر مشتمل عملہ غصہ پیدا کر دینے والی سُست رفتاری سے سامان کا اندراج کر رہا تھا۔مَیں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ ذلت آمیز انتظار اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اُکتاہٹ جیسی دو مشکلوں پر قابو رکھوں۔

یہ جولائی کی گرمی کے دن تھے۔دو تین شیشم کے درختوں کا سایا بھی تھا لیکن یہ سایا اُس لمبی لائن سے ہٹ کر تھا، جو کیبن کے سامنے لگی تھی۔قطار میں کھڑا ہونے والا ہر شخص سائے سے محروم تھا۔ ملاقاتیوں میں زیادہ عورتیں اور مرد بوڑھے تھے، جن کے چہروں پر صدیوں کی بے نوری، حسرتیں اور کرب دیکھے جا سکتے تھے۔جیل کے دیو ہیکل دروازے کے سامنے اِن کی حیثیت اُن بے کار اور بوسیدہ ہڈیوں کی تھی، جنہیں بے پروائی سے پھینک دیا گیا ہو۔اچانک میری نظر اُس خاتون پر جا پڑی، جس کی وجہ سے مَیں یہاں موجود تھا۔وہ میرے پہنچنے سے پہلے وہاں موجود تھی۔ اُس کے ساتھ اُس کا چودہ پندرہ سال کا بیٹا تھا۔اُن دونوں کے پاس بھی ایک گٹھڑی تھی۔کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ملاقات کو آئے تمام لوگوں کی گٹھڑیوں میں ایک ہی سامان ہوتا ہے۔ واہیات یکسانیت کے ساتھ، جس کو چرانے سے بھی کراہت آتی ہے۔

اُس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔مَیں نے اُس عورت سے رسمی سلام لیا اور سامان اُس کے بیٹے کے حوالے کر دیا، جو لائن میں اب چوتھے نمبر پر تھا۔مَیں نے پولیس والے کے پاس جا کر کچھ پیسوں کے ساتھ تمام بات سمجھا دی اور ہم دونوں کا سامان میرے ہی نام سے اندراج کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد میں دوبارہ گیٹ پر آ گیا اور ملاقات کی

منظوری کا لیٹر ایک کارندے کو پانچ سو روپے کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ جیل کے پاس بھجوا دیا۔ ایک گھنٹے تک کی بوجھل تھکاوٹ اور تاریک ڈیوڑھی کی بدبودار خاموشی کے بعد مجھے اُس قیدی سے ملاقات کی اجازت مل گئی۔

....

ڈیوڑھی کا اندرونی دروازہ پار کرنے سے پہلے میرے بائیں ہاتھ کی وِیٹ پر ایک ٹھپہ لگا دیا گیا۔ اِس کا مطلب تھا مَیں ملاقات کے بعد جیل سے باہر نکل سکتا ہوں۔ جیل کے دروازے کی ہیبت بہت زیادہ تھی۔ میرے اندر ہوتے ہی دونوں طرف کے تیس فٹ اُونچے اور آٹھ فٹ چوڑے آہنی پٹ بند ہوئے تو آواز کی دھمک میرے سینے پر لگی۔ اُس دن مجھے اندازہ ہوا کہ اندر کتنا خوفناک منظر تھا۔ باہر سے بڑی دیوار کے اندر ایک ہی جہان آباد لگتا ہے، جس میں رہنے والے ایک ہی قبیلے کے لوگ ہوں مگر ایسا نہیں تھا، اصلی جیل آگے تھی۔ ڈیوڑھی سے آگے ڈرا دینے والی دیواریں اور حیران کر دینے والے مناظر تھے، جنہیں آپ مناظر نہیں کہہ سکتے۔ یہاں پھر میرے سامنے ایک ایسی ہیبت ناک دیوار موجود تھی، جو بیرونی فصیل جتنی اُونچی تو نہیں تھی لیکن اس کی وحشت اُس سے کہیں زیادہ تھی۔ مٹی کی یہ کچی دیوار، جس کے اُوپر بجلی کی ننگی تاریں اور بڑی لائٹیں بھوتوں کی طرح ڈرا رہی تھیں، اصل میں جیل کی نگہبان تھی۔ اس پر چکنی مٹی، بھوسے اور باریک کنکروں کا لیپ کیا گیا تھا، جس کی مشقت بھی قیدیوں نے کی تھی۔ ایک سپاہی میرے ساتھ تھا، جس نے اس دیوار میں پیوست لوہے کے بڑے دروازے کی چھوٹی کھڑکی کھول کر مجھے اندر داخل کر دیا اور اندر سے ایک دوسرے سپاہی نے مجھے وصول کر لیا۔ اب مَیں حقیقی جیل میں داخل ہو چکا تھا۔ میری آنکھیں بے شمار دیواریں اور گلیاں دیکھ رہی تھیں۔ دھوپ سے بھری ہوئی۔ دیواروں میں لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے دروازے تھے۔ گلیاں ویران اور دیواریں گرمی سے ہونک رہی تھیں۔ نگہبان عملہ، جس کا مزاج قیدیوں سے مختلف نہیں تھا، ر‌ائفلیں پکڑے گویا اپنی ہی قید پر پہرہ دے رہا تھا۔ مَیں سپاہیوں کی نگہبانی میں ایک گلی سے دوسری اور ایک دیوار کے بعد دوسری دیوار سے نکلتا چلا گیا۔ مَیں نہیں جانتا، اب تک کتنے نگہبان مجھے ایک دوسرے کے حوالے کر چکے تھے۔ مَیں ایسی بھول بھلیوں میں پڑ گیا کہ اپنی مرضی سے واپس نہیں جا سکتا تھا۔ بہت سی بارکیں اور بارکوں میں رہنے والے قیدیوں کے پاس سے گزرا، جو اپنے پنجروں میں خونخوار جانوروں کی طرح

بند تھے۔ یہ سب جانور تھے؟ مَیں نے یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ہر بارک ایسی دنیا تھی، جس کا ساتھ والی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ اِن کے آپس میں نہ دن ملتے تھے نہ راتیں۔ بالآخر مجھے ایک ایسے چھوٹے سے احاطے میں لے جایا گیا، جس کی دیواروں پر لوہے کا جال پھیلا کر اُسے اُوپر سے مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ احاطے کے اندر چاروں طرف بندی خانے اس قدر مضبوط اور لوہے سے جکڑے ہوئے تھے کہ دیو بھی ہو تو اُوندھا پڑا رہے۔ ہر بندی خانے میں ایک آدمی تھا، جس کی لمبائی قیدی کے قد سے زیادہ نہیں تھی اور چوڑائی محض چار فٹ۔ اِسی کے اندر ٹائیلٹ بھی تھے۔ اُس کی بدبو قیدی کے دماغ میں اس طرح سرایت کرتی کہ اُس کے لیے زندگی اور موت میں فرق ختم ہو جاتا اور پھانسی کے وقت اُسے زیادہ تکلیف نہ ہوتی۔ یہ سب سزائے موت کے قیدی تھے، جنہیں جہنمی فرشتوں نے دھکیل کر اِن بندی خانوں میں جکڑ دیا تھا۔ یہاں خاموشی بین کرتی تھی اور قیدیوں کی بے نور آنکھیں اندھیروں سے خیرات مانگتی تھیں۔ مجھے انہی میں سے ایک قیدی سے ملاقات کرنا تھی، جس کی سزائے موت کے خلاف مَیں نے کورٹ میں اپیل کر رکھی تھی۔

یہی ہے آپ کا آدمی، نگہبان نے ایک بندی خانے میں نیم دراز شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ خوبصورت جوان تیس سال کا ہوگا۔ قید کی مصیبت نے چہرے میں بے رونقی تو پیدا کی تھی مگر نین نقش ذہانت اور کشش کی گواہی دیتے تھے۔ بالکل اپنے بھائی کی شکل پر تھا، جسے مَیں باہر چھوڑ آیا تھا۔ بندی خانے کی دیوار کے ساتھ پشت لگائے غنودگی میں کچھ سوچ رہا تھا۔ مَیں نزدیک ہوا تو اُس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ مَیں اُس قیدی کے سامنے بیٹھ گیا لیکن اُس نے نہ میرے سلام کا جواب دیا، نہ خیر باد کہا۔ ہم کچھ دیر خاموش ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے حتیٰ کہ لوہے کی سلاخوں نے بھی کوئی آواز پیدا نہ کی۔ مجھے اُس دن پتا چلا، موت میں کتنا سکوت اور وحشت ہے؟

میرا نام ثاقب علی ہے، مَیں نے بات شروع کی، عزیز احمد، مَیں تمھارا نیا وکیل ہوں، تمھاری ماں کو تمھاری زندگی کی ضرورت ہے، وہ چاہتی ہے، آپ کو بچا لیا جائے، مَیں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف سے خاموشی رہی۔ جواب نہ پا کر مَیں دوبارہ بولا، دراصل مَیں اسی طرح کے مشکل کیس لیتا ہوں، اور ایک دو بار کے علاوہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مجھے ناکامی ہوئی ہو۔ سمجھ لو اس طرح کے کیس میرے معمول ہیں۔

مَیں پھر چپ ہو گیا۔ اُس کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ مجھے پھر بولنا پڑا، آپ کی جگہ کسی دوسرے قیدی کی ماں اگر مجھے ہائر کر لیتی تو مَیں پورے خلوص کے ساتھ اُس کو بچانے کی کوشش کرتا۔ دراصل میرا یہ مسئلہ نہیں کہ مجرم نے کتنا گھناؤنا جرم کیا ہے۔ مَیں اُسے ہر طرح سے بچا کر لے جانا چاہتا ہوں۔ یہ میرے پیشے سے کی ضرورت بھی ہے۔ آپ اُن قتل کی وجوہات بلا جھجک بیان کر سکتے ہیں، مَیں ہر صورت اُن کی توجیہات اور اسباب نکال کر آپ کو مظلوم ثابت کروں گا، مجھے اس میں خاص ملکہ ہے۔

میری اس بات پر اُس نے سر اُٹھایا اور بولا، وہ کون سی بات ہے، وہ سبب کیا ہے جس کی وجہ سے آپ نے میرا کیس لیا ہے حالانکہ میری ماں آپ کی بھاری فیس دینے سے قاصر ہے۔

مَیں اُس کے اس سوال پر ایک دفعہ بوکھلا گیا لیکن فوراً اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا، مَیں نہیں جانتا۔

لیکن مَیں جانتا ہوں، اُس کی آنکھوں میں طاقت پیدا ہوئی، یہ بات بھی اُسی طرح کا راز ہے جس طرح پہلی بات تھی، جو بعد میں کئی زندگیوں کے قتل کا باعث بنی۔

اگر اُسے پتا تھا تو مجھے چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس معاملے میں جتنا اعتماد پیدا ہوتا، اچھا تھا چنانچہ مَیں نے واضح طور پر تو نہیں لیکن تائیداً کہا، عزیز احمد آپ کے کسی جاننے والے کا آپ کی ذات میں دلچسپی لینا فطری بات ہے، جس کے لیے فطرت کچھ اسباب پیدا کر دیتی ہے۔

اب وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہو چکا تھا۔ اُٹھ کے دوزانو ہوا اور بولنے لگا۔

ثاقب صاحب، آپ کا خیال ہے، فطرت سب ٹھیک کرتی ہے، اگر ایسا ہوتا تو میرے لیے یہ جگہ ہرگز ٹھیک نہیں تھی۔ دیکھیے، اس جگہ مَیں نے سینکڑوں قے کی ہیں، ٹائیلٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ کال کوٹھڑی کا یہ ٹائیلٹ جو میری عین پُشت کے ساتھ ہے، اس کی سڑانڈ میرے اندر بس چکی ہے۔ میری روح اور ہڈیوں کے گودے تک میں اس کی منحوس بدبو شامل

ہے۔ یہ ٹائیلٹ میری بجائے یہاں کے سپرینٹنڈنٹ کے لیے بھی ہوسکتا تھا لیکن وہ دن میرے لیے ہی تھا۔ اتنا بے برکت اور بدہیئت کہ مَیں اُس کی تصویر اپنی آنکھوں سے چھیل نہیں سکا حالانکہ مَیں کبھی غیرت مند نہیں رہا، نہ مجھے دعویٰ ہے کہ اس نام کی کوئی شے رسم سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مگر قیاس کیجیے، جب کوئی شخص اس طرح دلدل میں پھنس جائے اور اُسے یہ تک نہ پتا چلے کہ اپنے باپ کا ماتم کرے یا ماں کی خواہشات اور اُس کے فیصلوں کو روئے، تو اُس کے دماغ کا کرب کون جان سکتا ہے؟

آپ جو بھی ہیں، مَیں نے اب اُس سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا، آپ اس وقت میرے لیے ایسے قیدی کی حیثیت رکھتے ہیں، جو میرا ایک کیس ہے۔ مَیں آپ کو کیس کے نام سے پکارتا ہوں، بالکل ایک کاروباری شخص کی طرح۔ اب تمھیں فیصلہ کرنا ہے کہ میرے اور اپنی ماں کے ساتھ تعاون کر کے، اُن دو قتل کا راز بتانا ہے یا خموشی کو برقرار رکھتے ہوئے، اپنی موت پر توثیق کی مُہر ثبت کرنی ہے۔ یہ لوگ تمھاری پھانسی کے فوراً بعد آنکھیں اور گردے بلا معاوضہ جمع کر لیں گے۔ اگر تم یہ دونوں چیزیں سپرینٹنڈنٹ جیل کی بجائے، آزادی حاصل کرنے کے بعد قبر میں ساتھ لے جانا پسند کرتے ہو تو مجھے اُن قتل کے اسباب چاہییں۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے، جو شخص آپ کی مدد کرنے کے لیے مخلص ہو اور اُس پریشانی کا سبب پوچھ رہا ہو، جس کے بارے میں اُسے مدد کرنی ہے، اصل میں اُس کی وہ پریشانی اُس مدد کرنے والے کی وجہ ہی سے پیدا ہوئی ہوتی ہے۔ میری ماں، جس نے آپ اور آپ کو اس مہم پر روانہ کیا ہے، وہی اِس پورے قضیے کی ذمہ دار ہے لیکن میری مصیبت تو یہ ہے کہ وہ اِس تمام قصے کے متعلق بڑی معصومیت کے ساتھ بے خبر ہے۔ وہ نہیں جانتی، ہرگز را ہوا واقعہ نئے واقعے کا سبب بنتا ہے۔ مَیں نے یہ قتل پاگل پن میں نہیں کیا۔ میری ایک مصیبت تھی، جسے مَیں نے طاقِ نسیاں میں رکھ دیا تھا لیکن آسمان کی گردش نے وہ تصویر اچانک میرے سامنے لا کھڑی کی۔

دیکھیے، آپ وہ پریشانی اپنی ماں کی بجائے ایک ایسے آدمی کو سُنا رہے ہیں، جسے نہ واقعے سے مطلب ہے، نہ تمھاری ماں سے سروکار ہے اور نہ تمھارے عمل سے لینا دینا ہے۔ اُسے تو اپنی فیس وصول کرنا ہے، جس کا ایک حصہ یہاں آنے سے پہلے اکاؤنٹ میں جا چکا ہے۔ آپ

بات شروع کیجیے۔

میرے اِن جملوں کے بیانیے میں ایسی تاثیر تھی کہ وہ کچھ دیر خموشی سے سوچتا رہا، بالآخر تذبذب کے ساتھ اپنی کہانی شروع کر دی۔

جو کچھ اُس نے کہا، اُسے من وعن آپ کے سامنے پیش کروں گا کہ مجھے جس طریقے سے یہ بات سنائی جانی چاہیے تھی، اُس سے کہیں بہتر اُس نے بیان کر دی۔

ایک لمحے کے لیے اُس نے اپنا سر جھکایا پھر میری طرف دیکھا۔

آج سے پندرہ سال پہلے کی بات ہے۔ میرا باپ تبلیغ پر گیا تھا۔ وہ ایک سرکاری دفتر میں پندرہ گریڈ کا کلرک تھا اور رشوت کو ہدیہ سمجھتا تھا۔ اُس کا کام ایسا تھا کہ اُسے بہت سے ہدیے ملتے تھے۔ چوتھائی تنخواہ اور اُن ہدیوں کے لالچ میں کوئی نہ کوئی اُس کی جگہ کام کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا اور وہ ہر سال چار ماہ کے لیے تبلیغ پر نکل جاتا۔ اُس کا افسر اُس سے بہت خوش تھا۔ وہ اُن ہدیوں سے بہت کچھ اپنے افسر کو بھی دیتا۔ اُس وقت میرا وہ بھائی، جسے آپ باہر مل چکے ہیں، میری ماں کی گود میں تھا۔ مَیں پندرہ سال کا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُن دنوں بہت پُرکشش تھا۔ مَیں اپنی ماں کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔ ماں کے متعلق اور اُس آدمی کے متعلق، جو اسی جیل سے دو سال پہلے عمر قید کی سزا کاٹ کر نکل چکا ہے اور ایک سال پہلے گردے فیل ہونے سے مر چکا ہے۔ اسی جگہ پر، جہاں میں بیٹھا ہوں، کوئی بھی مر سکتا ہے۔ وہ شخص میرے باپ کا قاتل تھا اور میری ماں نے میرے باپ کو قتل کروایا تھا۔ وہی عورت، جس سے اچھی طرح آپ کی ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ میرے باپ کے قتل میں ملوث تھی۔ میرے باپ کے قتل سے پہلے سب کچھ جانتے ہوئے مَیں کیوں خاموش تھا؟ اس لیے کہ میری ماں میرے اور اُس شخص کی بیٹی کے متعلق بھی سب کچھ جانتی تھی۔ مجھے اُس لڑکی سے بے پناہ رغبت تھی۔ شاید میرے اور میری ماں کے درمیان خاموش معاہدہ تھا۔ پھر ایک دن میرے باپ کو میری ماں کے اور اُس شخص کے بارے میں پتا چل گیا۔

آپ یقیناً اس کہانی سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے لیکن اب جب کہ مَیں بات کھول رہا ہوں تو مجھے آپ کے کسی رویے سے کوئی غرض نہیں۔ میرا باپ میرے بارے میں زیادہ نہیں مگر کچھ نہ کچھ جانتا تھا۔ اُسے یہ بات اُس وقت قبول تھی، جب کہ لڑکا اُس کا بیٹا ہو اور لڑکی کسی دوسرے کی ہو۔ لیکن میری ماں کے فعل کو وہ برداشت نہ کر سکا اور یہ ایک ایسی بات تھی، جو ہم سب کے لیے بدبختی بن

گئی۔ بے خبری کتنی بڑی نعمت ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ ہزاروں خاندان انہی حالات میں بے خبری کے ساتھ ہی رہ رہے ہیں۔ شاید اُسی وقت میرے باپ اور میری ماں نے ایک دوسرے کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن میری ماں اور وہ شخص دو تھے اور میرا باپ اکیلا چنانچہ وہ قتل ہو گیا۔ مَیں اپنے باپ کا مدعی تھا مگر مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ مَیں اپنی ماں کا کیا کروں؟ وہ، جس کے مَیں صُلب سے تھا، اُس کا مقدمہ لڑوں یا وہ، جس نے مجھے نو ماہ اپنے پیٹ میں رکھا، اُس کی طرف داری کروں؟

مَیں، جسے اپنی ماں اتنی ہی عزیز تھی جتنا باپ، کس کرب کے ساتھ تھانے میں بیٹھا تھا۔ وہ عصر اور مغرب کا دورانیہ تھا۔ وہ شخص، جس نے چاقو سے میرے باپ کا گلا کاٹا تھا، اُس کا مَیں نام لینا نہیں چاہتا۔ جس نے اپنے باپ کے کٹے ہوئے گلے اور کاٹنے والے کو سامنے دیکھا ہو، وہ عام آدمی کی طرح نہیں ہے۔ وہ شخص بالکل ننگا تھا۔ تھانے کے صحن میں پکی اینٹوں کے فرش پر لیٹا۔ یہ اچھی بات تھی لیکن میری ماں اُس کے سامنے بیٹھی تھی اور مَیں بھی، جو اُن دونوں کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ بات بالکل ٹھیک نہیں تھی مگر انسپکٹر میری ماں کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا، جو اس عبرت کا مرکزی کردار تھی اور اب تھانے کے سُرخ برآمدے کے ستون کے ساتھ فرش پر بیٹھی میرے بھائی کو دودھ پلا رہی تھی۔ کتنی عجیب بات ہے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک بھاری پتھر کے نیچے آ چکی ہے، اپنے بیٹے کو دودھ پلانا نہیں بھولی۔ میری ماں کو اُس کے سامنے بٹھا دیا گیا کہ وہ اپنے ننگے عاشق کو عین قریب بیٹھ کے پٹتے دیکھے اور اُس کی اُس شے کو بھی، جو لٹک رہی تھی۔ وہ بکرے کی طرح چیخ رہا تھا۔ کبھی آپ نے بکرے کو ذبح ہوتے دیکھا ہے؟ وہ میری ماں کو بھی دیکھ رہا تھا، جسے انسپکٹر کی طرف سے گندی گالیاں دی جا رہی تھیں اور مَیں اُن کا حصہ بلاوجہ وصول کر رہا تھا۔ مَیں، جو اپنے باپ کا مدعی تھا۔ میری ماں کی گود میں میرا چھوٹا بھائی، جسے آپ باہر دیکھ چکے ہیں، وہ اِس المیے سے ناواقف، محض دودھ پینے میں مصروف تھا۔ کیا مَیں آپ کو سمجھا سکتا ہوں؟ مَیں اُس وقت کیا سوچ رہا تھا؟ میری ماں کیا سوچ رہی تھی؟ وہ بے شک غلط کار تھی لیکن اپنے دونوں بیٹے اُسے عزیز تھے۔ باوجود اِس کے کہ اُس نے اُن کا باپ چھین لیا تھا مگر یہ ایسی دلیل نہیں ہے، جسے دنیا مان لے یا میرا وہ چچا، جس کے بھائی کے گلے پر چھری پھیر دی گئی۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد، یہ وہی رات تھی، جب مَیں اپنی ماں کو تھانے میں چھوڑ کر گھر آ گیا حالانکہ انسپکٹر کی آنکھوں کی ہوس سب کچھ سمجھا رہی تھی۔ مَیں یہ باتیں سمجھنے میں اُس عمر میں پختہ

ہو گیا تھا۔ یہ آرام سے سونے والی رات نہ تھی، مگر مجھے پچھلی رات نیند آ گئی۔ مَیں کئی دن سے جاگا ہوا تھا۔ دوسرے دن صبح ہزاروں خدشوں کے ساتھ تھانے میں داخل ہوا۔ وہ یقین تھے۔ میرے پہنچتے ہی، جن کی تصدیق ہو گئی۔ محض انسپکٹر نہیں، آدھے تھانے نے جشن منایا تھا اور اُس کا تمام خرچہ میری ماں پر واجب ہوا، جو اُس نے رات بھر کی محنت میں چکایا۔ وہ تھکی ہوئی، جاگی اور سہمی ہوئی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھا، ایک ایسی لونڈی کی طرح، جس کا آقا اُسے معاف کر دینے پر قادر ہو، تمام خساروں کے ساتھ۔ یہ وہ خسارے تھے جنہیں کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ میرے خسارے تھے، میرے باپ کے تھے یا میری ماں کے؟ مَیں اس بارے میں نہیں جانتا۔

یہ سلسلہ کئی دن چلتا رہا، پھر دونوں کا چالان کر دیا گیا۔

ایک دن مَیں نے اپنی ماں کو معاف کر دیا لیکن اُس انسپکٹر کو نہیں کیا، جو میری ماں سے کئی دن مشقت لیتا رہا۔

مَیں نے شہر چھوڑ دیا، اپنی ماں کو چھوڑ دیا، اُس بھائی کو چھوڑ دیا، جس کا اس معاملے میں ناخن برابر قصور نہ تھا مگر انسپکٹر کو نہیں چھوڑا تھا۔ ایک عرصہ گزرا، شاید اس زخم کو بھول جاتا جو میرے دل پر بہت کاری لگ چکا تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔ اُس کے پھلنے پھولنے کے اسباب پھر پیدا ہو گئے۔

وہ اسباب بتانا چاہیں گے؟ میں نے پوچھا۔

مَیں نے سی ایس ایس پاس کر لیا۔ انٹرویو میں فیل ہو گیا۔ اس بارے میں زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ دراصل ہمارے خاندان میں افسری کی کوئی روایت نہیں تھی اور انٹرویو لینے والے اس بات میں حق بجانب تھے۔ جن کے آباؤ اجداد کے سلسلے میں سول سروس سے منسلک کوئی نہیں ہوتا اُن کے اندر سے گنوار پن کی بو نہیں جاتی۔ خیر لعنت بھیجیں اس بات پر۔ مجھے ایک اچھے ہوٹل میں اسسٹنٹ منیجر کی نوکری مل گئی۔ آپ جانتے ہوں گے، اس محکمے میں آنے کے بعد آپ کو بڑے بڑے وزرا اور شرفا کی تقریبات کا اہتمام کرنا ہوتا ہے۔ یہ شریف لوگ اُس وقت بہت بے ضرر ہوتے ہیں، جب وسکی کا گلاس لے کر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں اور متعارف ہوتے ہیں۔

یہی وقت تھا، جب وہ بدقسمت ایس پی، جو آج سے پندرہ سال پہلے تھانہ صدر کا نوجوان انسپکٹر تھا، اپنی بیوی کے ساتھ میرے سامنے آ گیا۔ وہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ مَیں نے اُسے قتل

کرنے کا فیصلہ کر لیا حالانکہ اب مجھے بھول جانا چاہیے تھا لیکن آپ کو سمجھ لینا چاہیے، انسان کی کچھ انفرادی ضد ہوتی ہے، جو کبھی کبھی سول سروس یا بیرا گیری کی اخلاقیات سے ہٹ کر فیصلہ کرنے پر اُکساتی ہے۔ یہی اُس دن میرے ساتھ ہوا اور مَیں نے اُسی رات میاں بیوی کو قتل کر کے اُن کی اٹھارہ سالہ بیٹی کے ساتھ ریپ کیا۔ وہ ریپ نہیں تھا۔ وہ اپنے والدین کے قاتل کے ساتھ خوشی خوشی سیکس کرتی رہی۔ دوسرے کمرے میں ہونے کی وجہ سے وہ اُس بڑے سانحے سے بے خبر تھی۔

مَیں نے پوری رات اُس کو لطف اندوز کیا۔ آپ کو اِس چیز سے مطلب نہیں لیکن مَیں سمجھتا ہوں، ایسی صورتِ حال میں بُری خبر سنانا، اُسے قتل کر دینے سے زیادہ شدید ہے۔ صبح سے پہلے اُسے کمرے میں چھوڑ کر مَیں ہوٹل سے نکل گیا۔ آپ اِس بات کو نہ بھولیں کہ مَیں اُسے آسانی سے قتل کر سکتا تھا اور واحد گواہ کو مٹا سکتا تھا لیکن مَیں اپنے گناہ کی تصدیق چاہتا تھا۔

حالانکہ تم جانتے تھے، اِس خواہش کی کتنی بڑی قیمت ہے؟ مَیں نے کہا، شاید موت کی صورت میں۔

وہ مسکرایا اور بولا، مَیں کبھی معاشرے کا معزز آدمی نہیں رہا۔ میرا ذلیل اور حقیر ہونا میری پیدائش کے ساتھ طے ہو چکا تھا۔ مَیں نے یہ مقام ہرگز کوشش سے حاصل نہیں کیا۔ نہ مَیں اپنی ماں اور باپ کے فیصلوں میں شامل رہا لیکن اُن کا پھل برابر وصول کیا۔ تو پھر آپ اِس قتل کو اُن واقعات کا تسلسل کیوں نہیں سمجھ لیتے۔

میرا خیال ہے، آپ یہاں کی نسبت اُس ہوٹل میں پُر سکون رہتے۔ مَیں نے کہا۔

اُس نے بات کرنے کے لیے اپنے جبڑے سختی سے بھینچے اور بولا، آج مجھے اِس جیل میں ڈیڑھ سال ہو گیا۔ پہلے دن لوہے کا اِتنا اُونچا، بھاری اور بڑا دروازہ بند ہونے کے بعد میرا وجود مجھے ایک کیڑے کی طرح لگا تھا، جو میرے اپنے اختیار میں نہیں تھا۔ جیل کا دروازہ بند نہیں ہوا تھا، میری زندگی کا گیٹ بند ہو گیا تھا۔ ایسا گیٹ، جس کی نہ صرف یہ کہ چابی میرے پاس نہیں تھی، بلکہ مَیں یہ بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ کس کے پاس ہونی چاہیے۔ مجھ پر ایسی مایوسی طاری تھی، جس میں صدیوں کا خسارا شامل ہو۔ یہ نہیں کہ مَیں اپنے پیچھے کسی بے سہارا عزیز کو چھوڑ آیا تھا۔ میری ایک ماں ہے، جسے آپ باہر مل چکے ہیں اور ایک بھائی ہے لیکن آپ ہی بتائیں مجھے اُن کی پروا کیسے ہو سکتی تھی؟ بہرحال آپ اِس بات کو چھوڑیں۔ مجھے یہ قیدِ مُردوں کی ایسی بستی میں لے گئی،

جن کی آوازیں آہ و بکا زندہ نہیں سنتے۔ چند لمحے اس مضبوط آہنی دروازے کی ڈیوڑھی میں کھڑا رہنے کے بعد ایک سپاہی نے مجھے کراہت آمیز حقارت سے آگے کی طرف دھکا دیا تو اس سیاہ ڈیوڑھی سے باہر چند حیا دینے والی روشنی تھی، جہاں دوپہر کا سورج لپکیں چھوڑ رہا تھا۔ یہ جیل کا احاطہ تھا۔ یہاں پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ کچھ اور بھی سیاہ بخت موجود ہیں۔ ہم سب کو ایک سفاک کرختگی سے لائن میں کر دیا گیا۔ ننگے پاؤں، ننگے سر، تانبے کی طرح تپے ہوئے کھردرے فرش پر کھڑے رہنا، اُس وقت قابل عمل ہو جاتا ہے، جب آپ کو بتا دیا جائے کہ آپ یہاں کیوں اور کب تک کھڑے ہوں گے لیکن جب یہ دونوں باتیں آپ نہ جانتے ہوں اور نہ پوچھنے کے مجاز ہوں تو تکلیف کی شدت بے اندازہ ہو جاتی ہے۔ مسلسل کھڑے رہنے سے، سب سے پیچیدہ امر بہنے والے پسینے نے پیدا کیا، جیسے نمک خوردہ پانی کا ڈول بھر کر انڈیل دیا گیا ہو۔ اس حالت میں ایسی خارش شروع ہو گئی، جسے ناخنوں کے مداوا کی اجازت نہیں تھی، خاص کر ناف کے زیریں حصوں۔ یہ وقت خودکشی کے لیے بہت آسان تھا لیکن اُس وقت ذرائع نہیں تھے۔ سہ پہر ہمیں یہاں سے آگے ہانکا گیا۔ یہ پہلا دن مجھ پر سخت گزرا تھا لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ مَیں یہاں منافع میں ہوں۔ اس جیل کے اندر دراصل سب حقیر اور ذلیل لوگ موجود ہیں۔ البتہ کوئی بڑا ذلیل ہے اور کوئی چھوٹا۔ یہاں معزز اور شرفا نہیں رہتے اور مجھے احساس نہیں ہوتا کہ میری تذلیل ہو رہی ہے۔ آپ ہی بتائیں، جہاں سب لوگوں کی تذلیل ہوتی ہو وہاں کوئی کیا ذلیل ہو گا۔ یہاں مَیں سکون میں ہوں کہ اس جگہ شریف لوگ نہیں آتے۔

ایک گھنٹے کی ملاقات کے بعد مَیں جیل سے باہر آ گیا۔ واپس اُسی طرح نگہبانوں نے ڈیوڑھی پر پہنچا دیا، جس طرح وہاں سے لے گئے تھے۔ ڈیوڑھی کے دروازے کے پاس میرے بائیں ہاتھ کی دستی پر ٹھپا دیکھا گیا، جو اندر جاتے ہوئے میری شرافت کی گواہی کے طور پر لگایا گیا تھا۔ شرافت کے اس سیاہ ٹھپے کی موجودگی بتا رہی تھی کہ مَیں باہر کا آدمی ہوں، میرا جیل اور جرم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ باہر تمام منظر کھلا کھلا تھا، ہر طرف پاک صاف لوگ تھے، شرافت کے سیاہ ٹھپے لگے ہوئے لوگ۔ معزز لوگوں کا ایک جم غفیر سڑکوں پر رواں دواں تھا، دفتروں میں کام کر رہا تھا، نمازیں پڑھ رہا تھا، حج کو جا رہا تھا، اسمبلیوں میں تقریریں کر رہا تھا۔ انھی میں سے ایک مَیں تھا، اور اب میرا رُخ اُس کی ماں کی طرف تھا۔ مجھے کیا معلوم، مَیں اُس کے پاس کیا لینے جا رہا تھا۔

تمغہ

ڈی آئی جی سمیت پولیس کے تمام افسران موجود تھے۔ سُرخ قالینوں اور کرسیوں پر لوگوں کی بڑی تعداد جمع تھی۔ اسٹیج کو پولیس کے شہدا کی تصویروں اور پھولوں سے سجا دیا گیا تھا۔ اناؤنسر نے مختصر تمہید کے بعد ڈی آئی جی شمس الحسن کو ڈائس پر آنے کی دعوت دی۔ ڈی آئی جی ڈائس پر آئے تو ہال میں مکمل خاموشی طاری ہوگئی۔

حضرات! آپ جانتے ہیں، پنجاب پولیس نے کس طرح اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر کے جرائم پر قابو پایا ہے۔ ہم اپنے جوانوں کو سلام پیش کرتے ہیں، جو معاشرے کے بدمعاش اور ناسوروں کا مقابلہ دلیری سے کر کے اُن کو کیفر کردار تک پہنچاتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح آج ہمیں پھر اپنے ان دو جوانوں پر فخر ہے، جنہوں نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر انسانیت کے دشمنوں کا خاتمہ کیا ہے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر حمید سندھو صاحب ہیں، جس کی کارکردگی پچھلے کئی سالوں سے پنجاب پولیس کو کامیابیوں سے ہمکنار کر رہی ہے اور دوسرے عابد بلال ہیں، جس نے اس کے شانہ بشانہ کام کیا۔ میں ان دونوں کو اگلے اسٹیج پر ترقی دیتا ہوں، یہ کہہ کر ڈی آئی جی صاحب ایک طرف ہو گئے اور اناؤنسر نے دوبارہ ڈائس پر آ کر اعلان شروع کیا، حمید سندھو صاحب اسٹیج پر آ کر اپنا تمغہ وصول کریں۔

حمید سندھو تالیوں کے شور میں پُر اعتماد قدموں کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھا اور اپنا تمغہ وصول کیا۔ ڈی آئی جی صاحب نے اُس کے کاندھے پر بیجز بھی لگائے۔

اب میرا نام پکارا جانا تھا، جس کے تصور سے میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے اور ٹانگوں میں لرزا طاری تھا۔ مجھے ڈر تھا گر نہ پڑوں۔ میری ساری توجہ اپنے آپ کو قابو میں رکھنے پر تھی۔ ایک دفعہ خیال آیا، واش روم جانے کا بہانہ کر کے بھاگ جاؤں لیکن اب وقت

نہیں تھا اور مجھے ہر حالت میں اسٹیج پر جا کر اپنا تمغہ وصول کرنا تھا۔

....

یہ شہر قصبے سے کچھ ہی بڑا تھا۔ مشرق کی طرف بیس کلومیٹر کے فاصلے پر دریا ہے۔ دریا جولانی پر آتا تو دور تک پھیل جاتا، جس کی وجہ سے اِدھر اُدھر جنگلات بن گئے۔ جنگلات اس لیے بھی زیادہ تھے کہ تمام علاقہ رینجر کی حدود میں تھا اور وہ درخت کاٹنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہاں ہزاروں زمیندار تھے اور سب نے غنڈے پال رکھے تھے۔ یہ غنڈے پورے علاقے میں مجرمانہ کارروائیاں کرنے کے بعد اِن زمینداروں کے پاس پناہ لیتے۔ کسی زمیندار کو مخالف سے نپٹنا ہوتا تو اپنے غنڈے کے ذریعے ہی دو دو ہاتھ کرتا۔ گویا غنڈوں کو پناہ دینا زمینداروں کی بقا کا مسئلہ تھا۔ مَیں کم و بیش سب زمینداروں اور اُن کے متعلقہ غنڈوں سے واقف تھا لیکن اپنی مرضی سے کارروائی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ویسے بھی میرا منصب محض ایک حوالدار کی حیثیت سے بڑوں کے کاموں میں دخل دینا یا تھانے کی پالیسی وضع کرنا نہیں تھا۔ تھانے دار کو اُس کا مطلوبہ حصہ وقت پر پہنچ جاتا چنانچہ پولیس اپنا اثر و رسوخ عموماً شہری حدود میں رکھتی۔ گویا پولیس، زمینداروں اور غنڈوں کے درمیان ایک خموش معاہدہ تھا۔ البتہ گرجی مہر پچھلے دو سال سے اس معاہدے سے باہر ہو چکا تھا۔ وہ علاقے کے زمینداروں، غنڈوں، پولیس اور عوام، سب کے لیے خطرہ بن چکا تھا۔ اُسے کوئی بھی پناہ دینے یا ہمدردی کے قابل نہ سمجھتا۔

مَیں نے اُسے اڑھائی سال پہلے حاجی شمس خاں کے ڈیرے پر دیکھا۔ حاجی شمس کی جلال کوٹ گاؤں میں تین ہزار ایکڑ زمین تھی اور گرجی اُسی کا پالتو غنڈہ تھا۔ اُس وقت ایسا خطرناک نہیں تھا۔ مَیں اپنے تھانیدار کے ساتھ وہاں کسی ملزم کے حوالے سے گیا تھا۔ اِن علاقوں کے تھانیداروں کا معمول تھا کہ وہ کسی ملزم کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تو سیدھے زمینداروں کے ہاں جاتے۔ اگر ملزم کو پولیس کے حوالے کرنا ناگزیر ہوتا تو خود حوالے کرتے ورنہ وہیں مک مکا کر کے چھوڑ دیا جاتا۔ اُس دن سہ پہر کا وقت تھا اور موسم سخت روشنی کا تھا۔ حاجی شمس ڈیرے سے ملحق اپنے گھر میں تھا۔ ہم نے اُسے اپنی آمد کی اطلاع بھجوائی اور وہیں بیٹھ گئے۔ ڈیرے پر بہت سے لوگوں کے موجود ہونے کے باوجود مکمل سکوت تھا۔ گرجی مہر بھی ایک طرف سنجیدگی سے بیٹھا کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔ یہ ساڑھے پانچ فٹ قد میں کمزور سا شخص تھا۔ چھوٹی چھوٹی باریک مونچھیں، کاندھے اندر کو دھنسے ہوئے، چہرہ بے رونق، گندمی رنگ اور بمشکل پچاس کلو وزن کا ہوگا۔ پہلی نظر دیکھنے سے مجھ پر اس کا

کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ ایک چارپائی پر سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا پینٹ شرٹ پہنے، نہایت متفکرانہ انداز میں لیٹا آسمان کو گھور رہا تھا۔ مجھے خیال گزرا لڑکا حاجی شمس خاں کا بھانجا یا بھتیجا ہے لیکن پولیس والوں کی عادت کے مطابق تھانیدار نے اُس پُر اسرار خوشی میں لڑکے کی موجودگی کی کُرید شروع کر دی اور بالآخر بات کھل گئی۔ لڑکا گرجی مہر کا واقف تھا اور لاہور سے ایک لڑکی بھگا لایا تھا۔ لڑکے کی شکل انتہائی معصوم تھی۔ نرم رخساروں پر ابھی سبزے کی آمد تھی، جسے شیو کر کے صاف کیا تھا لیکن سفید اور چکنے چہرے پر ہلکی ہلکی لویں دوبارہ نمودار ہو رہی تھیں۔ گرجی مہر سے خدا جانے اُس کا تعلق کیسے ہوا؟ مجھے اس تمام صورت حال سے خوف سا آنے لگا اور مَیں لڑکے کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو گیا مگر خود کو قابو میں رکھا اور لڑکے سے توجہ ہٹا لی۔ دو گھنٹے بیٹھے رہنے کے باوجود حاجی شمس گھر سے باہر نہ آیا اور نوکر کے ہاتھ پیغام بھیج دیا کہ تین دن بعد آپ کے مطلوبہ شخص کو تھانے حاضر کر دیا جائے گا۔ ہم واپس آ گئے لیکن دوسرے دن خبر ملی کہ گرجی مہر حاجی شمس کو قتل کر کے فرار ہو چکا ہے۔ واردات کی خبر ملتے ہی ہم وہاں پہنچے۔ لاش اور موقع واردات کا جائزہ لیا تو معاملہ کھل کر سامنے آ گیا۔ ہوا یہ کہ حاجی شمس نے لڑکی پر قبضہ جما لیا تھا اور اُسے لڑکے کے حوالے کرنے سے ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ حتیٰ کہ اُس نے گرجی مہر کی بھی نہ سنی اور لڑکی سے خود نکاح کرنے کا بندوبست کرنے لگا۔ اس صورت کے پیشِ نظر گرجی نے لڑکے کو ساتھ لے کر حاجی شمس کے گھر پر حملہ کر دیا اور حاجی شمس سمیت تین بندوں کو قتل اور آٹھ لوگوں کو زخمی کر کے اور لڑکی کو لے کر فرار ہو گئے۔ لڑکا موٹر سائیکل چلانے کا ماہر تھا اس لیے کسی کے ہاتھ نہ آئے۔ بعد میں صورتِ حال بدل کر ایک نئی شکل اختیار کر گئی۔ لڑکی کے ورثا کی طرف سے پہلے ہی اغوا کا مقدمہ درج تھا اور اب چار آدمیوں کے قتل بھی اُن کی کمر آ گیا۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور وہ اپنے گھر لوٹ آئی لیکن خود اشتہاری ہو گئے کہ پکڑے جانے کی صورت میں پھانسی پکی تھی۔ لڑکے کے ورثا نے، جو لاہور میں اچھے کھاتے پیتے تھے، بہت دفعہ کوشش کی اور پیغام چھوڑے کہ واپس آ جائے لیکن وہ پکڑے جانے کے خوف سے گھر نہ آیا۔ سب سے بڑھ کر خرابی یہ ہوئی کہ انھوں نے ڈکیتی کی وارداتیں شروع کر دیں۔ پولیس نے اُن کو پکڑنے کی کئی کارروائیاں کیں لیکن ہر دفعہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور مزید وارداتیں کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ حوصلے اتنے بڑھے کہ بھرے مجمعوں میں اندھا دھند فائرنگ کر کے واردات کر جاتے۔ ان ڈکیتیوں میں کئی لوگوں کو قتل اور زخمی کیا۔ انھوں نے اپنا کام اس طرح سنبھالا کہ لڑکا موٹر سائیکل چلانے کا فریضہ ادا کرتا اور گرجی

ڈکیتی اور قتل کرنے کا کام۔ دو سال گزر گئے اور وہ قابو میں نہ آ سکے۔

ایک دن میں چھٹی لے کر گھر جا رہا تھا۔ لوکل ریلوے اسٹیشن پر بیٹھا ریل کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ان علاقوں میں لوکل ریل چلتی ہے، جو رائیونڈ سے بڑی لائن سے الگ ہو کر قصور، چونیاں، منڈی ہیرا سنگھ، بصیر پور، حویلی لکھا، پاکپتن اور عارف والا سے ہوتی ہوئی وہاڑی اور دوسرے چھوٹے چھوٹے شہروں سے گزر کر دوبارہ بڑی لائن پر چڑھ جاتی ہے۔ میرا گھر رائیونڈ جنگ میں تھا جو رائیونڈ سے قصور جانے والی لائن پر ہے۔ ریل کے ذریعے سفر کا فائدہ یہ تھا کہ یہاں سے بیٹھتا اور سیدھا گھر کے سامنے اُتر جاتا۔ دو بجے دن کا وقت تھا اور ریل آنے میں کچھ وقت تھا۔ ابھی میں ریل کی پٹڑی پر چڑھا ہی تھا کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کا خوفناک شور برپا ہوا اور ایک ہی دم ہنگامہ پھیل گیا۔ شور سن کر میں اُچھلا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آواز حاجی صداقت کی آڑھت کی طرف سے آئی تھی، جو شہر کے اُس واحد ریلوے پھاٹک کے ساتھ تھی، جو شہر کی مرکزی سڑک پر تھا۔ لوگ ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اُس وقت نہتا ہونے کی وجہ سے عملی کارروائی کرنے سے گریز ہی بہتر تھا۔ آڑھت کے پاس آیا تو دو لاشیں خون میں لت پت پڑی میرا منہ چڑا رہی تھیں۔ اس واردات میں نامراد نے کھلے بازار میں گولیوں کا ایسے مینہ برسایا کہ راہگیر چوڑوں کے بل گر گر پڑے۔ س کا کلیجہ تھا جو پیچھا کرتا۔ بازار کے اگلے ہی موڑ پر لطیف کپڑے والے کے منہ میں کلاشنکوف کی نال ڈال کر پورا تین کلو سیسہ غریب کے پیٹ میں داخل کر دیا اور پیسوں کا تھلا بیگ میں اُلٹ لیا۔ لوٹ سے فارغ ہو کر موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا، لڑکے نے موٹر سائیکل ایسے اُڑایا، جیسے آنکھوں کے آگے سے چھلاوہ نکل گیا ہو۔ پل میں شہر بھر کو تلپٹ کر کے یہ جا وہ جا، ہوا کی طرح اُڑ گئے۔ میں یہ سارا معاملہ ریل کی پٹڑی کے دائیں جانب کھڑا دیکھتا رہا۔ چھوٹا سا شہر تھا، پولیس کو پہنچنے میں وقت نہیں لگا۔ افراتفری مچ گئی اور پورا شہر واقعے کی جگہوں پر سٹ گیا۔ میں کافی دنوں بعد گھر جا رہا تھا اور ڈر تھا کہ چھٹی کینسل نہ ہو جائے۔ فوراً نظریں بچا کر وہاں سے کھسکا اور اسٹیشن پر آ گیا اور ریل آئی تو بھاگ کر چڑھ گیا لیکن گھر پہنچنے سے پہلے ہی واقعے کی اطلاع پہنچ گئی اور یہ بھی کہا گیا کہ آپ کی چھٹی کینسل ہے، فوراً واپس پہنچو۔ مجھے اس حکم پر تکلیف بہت ہوئی مگر حکم حاکم تھا۔ دوسرے دن شام چار بجے کی ریل سے واپس ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا۔ پولیس اس نئی واردات سے ایسے حرکت میں آئی، جیسے تلووں میں آگ لگی ہو۔ دوسری طرف گرجی مہر کے متعلق طرح طرح کی توہمات عوام میں مشہور

ہونے لگیں۔ کسی کے مطابق وہ سب کچھ پولیس کی اشیرواد سے کر رہا تھا۔ کوئی اُسے انڈیا کی رینجر کا ایجنٹ قرار دینے لگا، جو واردات کرنے کے بعد بارڈر پار کر جاتا۔ اگرچہ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن اس میں بھی شک نہیں تھا کہ اُس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا اور پولیس کے لیے مستقل دردِ سر بن گیا۔
ڈی پی او صاحب نے اعلان کروا دیے کہ مخبر کو دولاکھ انعام ملے گا۔ ایگل فورس کے کئی دستے دو دو کی شکل میں ترتیب دے کر پورے علاقے کی مکمل ناکہ بندی کر دی گئی۔ میری ڈیوٹی سب انسپکٹر حمید سندھو کے ساتھ لگا دی گئی۔ حمید سندھو کو چھ سال پہلے ایلیٹ فورس میں بحیثیت کانسٹیبل شامل کیا گیا تھا۔ اس دوران اُس نے بیسیوں پولیس مقابلوں میں حصہ لیا اور درجنوں جرائم پیشہ افراد کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ دو دفعہ خود بھی گولی کا نشانہ بنا لیکن موت سے بچ نکلا۔ چھ فٹ قد اور جسامت کی تختی نے اُس کے اندر طاقت کا ایک احساس پیدا کر دیا تھا، جس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے، اُس نے صرف چھ ہی سال میں سب انسپکٹر کا عہدہ حاصل کر لیا۔ سندھو کا تعلق ساہیوال ڈویژن کی ایگل فورس سے تھا لیکن دو سال سے اُس کی تعیناتی سرگودھا ڈویژن میں تھی۔ اب جب کہ گرجی نے بصیر پور کے حالات اس قدر خراب کر دیے تو ڈی پی او اوکاڑہ نے اُسے سرگودھا ضلع سے طلب کر لیا۔ سندھو کی روز افزوں ترقی پر نہ صرف مجھے بلکہ تمام سکواڈ کو پرلے درجے کا حسد اور کینہ تھا لیکن ہم اپنی دو سال کی ناکامی کو کہاں لے جاتے، جس نے ہمیں نہ صرف عملی طور پر بلکہ ذہنی شکست سے بھی دوچار کیا۔
ہم سندھو کی اس عزت افزائی پر سوائے کڑھنے کے کچھ نہیں کر سکتے تھے اور خدا سے دعا گو تھے کہ سندھو بھی ناکامی سے دوچار ہو۔ عملی کارروائی کے لیے ہمیں جو علاقہ دیا گیا وہ بصیر پور سے لے کر سہاگ نہر، پھر وہاں سے دریا کو پار کر کے چک محمد پورہ سے ہوتے ہوئے بارڈر تک چلا جاتا تھا۔ یہاں جنگلوں اور ویرانیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا، جہاں نہ آسانی سے پولیس کی گاڑی جا سکتی اور نہ دوسرے ذرائع ہی کام کرتے تھے۔ وہ دو سال سے انہی علاقوں میں گھوم رہا تھا۔
میرا سابقہ ریکارڈ اس بات کا گواہ تھا کہ مَیں متحمل مزاج اور سوچ سمجھ کر کارروائی کرنے والا بہادر آدمی تھا۔ میرا خیال ہے، میرے بارے میں یہ بات اُس وقت بالکل صحیح ہے، جب میں اپنے سے کم درجے کے لوگوں کے ساتھ کام کر رہا ہوں، سندھو کے ساتھ کام کرنے سے میری حیثیت دب جانے کا امکان تھا کیونکہ مَیں بہرحال اُس جیسا مضبوط اعصاب کا مالک نہیں تھا۔ ڈی پی او صاحب نے انفارمیشن آلات سے لے کر ہتھیاروں تک کا تمام ضروری سامان ایگل فورس

کے دستوں کے حوالے کر کے گرجی کو پکڑنے کے لیے دو ماہ کا وقت مقرر کر دیا۔ میں اور سندھو بھی اپنے علاقے کی چھان بین اور غیر متوقع کارروائی کے لیے کام کرنے لگے۔

یہ پورا علاقہ بیلے، جنگل، نہریں اور چراگاہوں پر مشتمل ہے، اس لیے گائیں اور بھینسوں کی کثرت تھی۔ ہم نے بھینسوں کے بیوپاری کا بھیس بدل لیا اور نئی ۱۲۵ ہنڈا موٹر سائیکل پر جگہ جگہ کھوج مار کر گرجی کے متعلق سُن گن لینے لگے۔ لباس کے لحاظ سے ہم مکمل دیہاتی اور بیوپاری تھے۔ میلے صافے، لنگی اور کرتے پہنے، شیویں بڑھی ہوئی، ہاتھوں میں ڈنگوریاں پکڑی اور پاؤں میں مقامی موچی کے ہاتھوں تیار چمڑے کے جوتیوں پورا ڈیڑھ مہینہ ہم نے اس کام میں صرف کیا۔ اس دوران آٹھ بھینسیں بھی خرید کر آگے بیچ دیں۔ اس کام میں ہمیں واقعی اتنا منافع بھی ہو گیا کہ ایک دفعہ سندھو نے مجھ سے مذاق میں کہا، کیوں نہ نوکری چھوڑ کر یہی کام کر لیں۔ سچ یہ ہے کہ اس ڈیڑھ مہینے میں ہمارا منافع چار تنخواہوں کے برابر نکل آیا۔

وقت سمٹتا گیا اور ہم غیر محسوس طریقے سے اُن کے نزدیک ہوتے گئے۔ ہمارے پاس جو نقشہ تھا اُس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ علاقہ، امیرا تیجے کا، سے آگے نہر کی جھال کو عبور کر کے دریا کے ساتھ ساتھ جنگلوں کا تھا، جہاں نہ پولیس کی گاڑی جا سکتی تھی اور نہ آدم نہ آدم زاد۔ یہ تمام جگہ دس کلومیٹر مربع میں مکمل غیر آباد اور بارڈر تک چلی گئی تھی۔ ہم نے تین چار جگہ یہاں اپنے مورچے بنا لیے اور مسلسل رات چھپتے رہے۔ چھوٹی گنیں، پسٹل اور خنجروں کے علاوہ لوہے کی نوکیلی اور بھاری سلاخیں بھی پاس تھیں۔ ہمیں پتا چلا، گرجی کسی بھی جگہ دو راتیں مسلسل نہیں گزارتا۔ متواتر ٹھکانا تبدیل کرتا ہے لیکن مطلوبہ علاقے میں کسی بھی جگہ مہینے میں ایک آدھ رات ضرور ٹھہرتا ہے۔ اُس کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اُس نے یہ علاقہ مستقل طور پر نہیں چھوڑا تھا۔ اس لیے ہم نے اسی خطے کو توجہ کا مرکز بنا لیا لیکن ہمارا اُس کا سامنا نہ ہو سکا۔ بات یہ تھی کہ وہ واردات کرنے کے بعد کم از کم دو تین مہینے روپوش ہو جاتا اور بالکل سامنے نہ آتا۔ ایک بات جو ہمارے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوئی، وہ یہ کہ اُسے ریڈیو پر بی بی سی کی خبریں سننے کا بہت شوق تھا۔ لوگوں نے اُسے یہ کہتے سُنا تھا، انشاء اللہ میرے قتل کی خبر بی بی سی پر چلے گی۔ ہم نے ڈی پی او صاحب سے ریڈیو ریڈار سسٹم حاصل کر لیا اور اردگرد کے پانچ کلومیٹر میں بی بی سی کی خبروں کے وقت ریڈیو کی لہریں کیچ کرنے لگے، جس سے اُس کی سمت اور فاصلے کا بھی پتا چلایا جا سکتا تھا۔ علاقے میں جس

جس کے پاس ریڈیو تھا، ہماری نگرانی میں آ گیا۔ اس طرح ہماری تلاش کی حدود سکڑ گئیں اور مزید آسانی ہو گئی۔ اس میں ہمارے ایک مخبر کا بہت زیادہ عمل دخل تھا، جسے ہم نے زبردستی مخبر بنالیا تھا۔ پچھلے دو مہینے کی محنت کے بعد اس بات کا پکا یقین ہو گیا کہ یہ شخص گرجی کا مخبر ہے اور اُسے علاقے کی صورت حال کے بارے میں مطلع کرتا ہے۔ جب زمین صاف دیکھتا ہے تو نئی کارروائی کا سگنل دے دیتا ہے۔ اس سلسلے میں بصیر پور کا ایک پی سی او والا بھی ملوث تھا۔ ہم نے سارا کام خفیہ رکھا، حتیٰ کہ اپنے تھانے اور ڈی پی او کو بھی بتانا مناسب نہ سمجھا۔ ہم نے دونوں مخبروں کو اغوا کر لیا اور اگلی کارروائی شروع کر دی۔

تمام کارروائی میں اگرچہ مَیں ساتھ تھا لیکن مجھے اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ یہاں تک پہنچنے میں صرف اور صرف حمید سندھو کے دماغ کو دخل تھا، لیکن اُس نے ہر قدم پر مجھے یہ باور کرایا کہ گویا سب کچھ میری وجہ سے ٹھیک ہو رہا ہے اور مَیں اس کیس میں بہت اہم ثابت ہو رہا ہوں۔ یہ چیز اُس وقت میری ذات کو اور بھی پست کر رہی تھی اور مَیں لاشعوری طور پر اُس سے اتنا مرعوب ہو گیا کہ اُس کے کسی بھی حکم کی نافرمانی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ان دو مہینوں میں حمید سندھو نے میری ذات کو گویا بہت متاثر کر دیا۔

یہ سردیوں کی ایک ٹھنڈی صبح تھی۔ ٹھنڈ اتنی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ہم نے موٹر سائیکل چک لکھا کے قبرستان ہی میں رکھ دی کہ اُس کی آواز قرب و جوار میں دور تک جاتی تھی۔ مخبر سراج دین عرف سراجے نے ہمیں بتایا، گرجی رات ایک بجے اپنے ساتھی لڑکے کے ساتھ ڈلے کی بھٹی پر پہنچا ہے۔ وہ ساری رات سفر میں رہا ہے اس لیے ابھی تک سویا ہوا ہے۔ اگر ہم پیدل نہر کے ساتھ ساتھ جائیں تو وہاں پہنچنے میں مشکل سے چالیس منٹ لگیں گے۔ ہم نے جلدی سے تیاری کی اور پیدل نکل لیے۔ یہ سفر ایسا آسان نہیں تھا کہ چلنے کو ڈھنگ کی کوئی پگڈنڈی یا راستہ نہیں تھا، تمام راہ جھاڑ جھنکاڑ سے بھری ہوا اور نہایت دشوار تھی لیکن ہمارے لیے یہ بات کچھ حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ کبھی دوڑتے اور کبھی تیز چلنے لگتے، ٹھیک دس بجے ہم گرجی کے سر پر پہنچ گئے۔ وہ عک کے پودوں کے درمیان ایک پرانی کوٹھڑی میں تھا، جسے کسی زمانے میں کھوئے کی بھٹیاں چلانے والوں نے بنایا تھا لیکن چار پانچ سال پہلے جو سیلاب آیا، اُس میں یہ جگہ دریا کی لپیٹ میں آنے سے بے آباد ہو گئی، تب سے کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔ بھٹیاں تو بالکل ختم ہو گئیں لیکن یہ بے آباد کوٹھڑی پکی اینٹوں اور بلند جگہ

پر ہونے کی وجہ سے بچ گئی تھی۔ اس کے ارد گرد کیکروں کے بے شمار درخت تھے۔ کوٹھڑی کا دروازہ اندر سے بند ہونے کی وجہ سے ہم انہیں دیکھ تو نہ سکے البتہ اُن کے موٹر سائیکل کے ٹائروں کے نشان واضح دکھائی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ سانس لینے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ جب ہمیں ہر طرح سے یقین ہو گیا کہ وہ دونوں موٹر سائیکل سمیت اندر ہیں، تو ہم ایکشن کے لیے تیار ہو گئے۔ اب ہمارے سامنے دو راستے تھے کہ باہر رُک کر اُن کا انتظار کیا جائے یا فوری حملہ کر دیا جائے۔ میری صلاح یہ تھی کہ پولیس کو اطلاع کر کے بلوا لیا جائے مگر سندھو نے اس بات کو سختی سے رد کر دیا اور فوری حملے کا پلان بنانے لگا۔ وہ موقعے کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، اگرچہ گرجی کا اس دُھند اور کہر سے فائدہ اُٹھا کر بھاگ نکلنے کا بہت اندیشہ تھا۔ دروازہ بہت حد تک بوسیدہ تھا اس لیے فیصلہ ہوا کہ زور کا دھکا دے کر اُسے گرا دیا جائے۔ سراجے کو ہم نے احتیاطاً ایک کیکر کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا تا کہ وقت پر دھوکا نہ دے۔ ہم نے چار قدم پیچھے ہٹ کر پوری طاقت سے اپنے آپ کو دروازے سے ٹکرا دیا۔ دروازہ ایک دھماکے سے اپنے تختوں سمیت اندر جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے فائر کھول دیے۔ گولیاں اتنی تیزی اور شدت سے چلائیں کہ گرجی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا البتہ دونوں کی چیخیں ایک دو منٹ ضرور بلند ہوئیں۔ بھرپور فائرنگ کے بعد ہم نے دس منٹ تک انتظار کیا، جب کوئی حیل حجت نہ ہوئی تو حمید سندھو ٹارچ جلا کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ کمرے کا نقشہ تلپٹ ہو چکا تھا۔ گرجی مہر چارپائی پر خون میں لت پت تھا جبکہ دوسری لاش دکھائی نہیں دی لیکن جیسے ہی دائیں طرف کے کونے میں لائٹ کی گئی تو مٹی کی بنی ہوئی کھرلی نظر آئی، جو چھ فٹ تک لمبی اور دو فٹ اُونچی دیوار کے ساتھ بنی تھی۔ وہاں لڑکا خوشی سے زخمی حالت میں سُکڑا ہوا لیٹا تھا۔ وہ اس قدر سہما اور ڈرا تھا کہ مجھے اُس سے ایک دفعہ وحشت سی ہوئی۔ گولی اُس کے بائیں کاندھے پر لگی تھی، جس سے خون رس رس کر کھرلی کی تہ سے چپک رہا تھا۔ لڑکے پر حمید کی نظر پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ لڑکا بہت خوبصورت تھا۔ سندھو کچھ لمحے اُسے دیکھتا رہا۔ مَیں نے دیکھا، اچانک اُس کی آنکھوں میں ہوس تیرنے لگی۔ سندھو کی آنکھوں کی بدلتی کیفیت کو دیکھتے ہوئے مَیں نے کہا، سر اسے جلد اُٹھا کر ہاسپٹل پہنچانا چاہیے ورنہ لڑکا مر جائے گا لیکن اُس نے میری آواز گویا سُنی ہی نہیں اور مسلسل لڑکے کو گھورتا رہا۔ مجھے اس پورے منظر نامے سے ڈر لگنے لگا اور چاہتا تھا، کسی طرح سے لڑکے کو نکال کر لے جاؤں۔ چند لمحوں کی کشمکش و پیچ کے بعد مَیں اُسے اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا تو سندھو نے مجھے خوفناک طریقے سے دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا، اگر مَیں نے ذرا بھی

زحمت کی تو یہ مجھے فائر مار دے گا۔ بالکل اُسی لمحے اُس نے مجھے دھکا دے کر کوٹھڑی سے باہر کر دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد لڑکے کی کراہوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ مَیں وہاں سے کھسک کر کیکر سے بندھے سراجے کے پاس آگیا تا کہ آواز میرے کانوں میں نہ پڑے اور گومگو کی حالت میں رہا کہ واقعے کے انجام تک پہنچنے کی خبر کے ساتھ لڑکے کی بابت پولیس کو مطلع کر دوں لیکن اُس وقت بزدلی نے مجھ پر ایسا شدید غلبہ کیا کہ مَیں کچھ بھی نہ کر سکا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔ کمرے سے لڑکے کی آواز مزید بلند ہوتی گئی، جس سے میرا کرب بڑھتا گیا، گویا کانوں کے پردے پھاڑ کر دل میں ضربیں لگا رہی ہو۔ مَیں دماغ میں طرح طرح کے منصوبے بنا کر رد کرنے لگا۔ حتیٰ کہ اس عمل کو دس منٹ سے زیادہ ہو گئے۔ یہ حالت میرے لیے نحوست کو بڑھا دینے والی اور کراہت پیدا کر دینے والی تھی۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ غصے اور کراہت نے مجھ میں ایسا اُکتا دینے والا جذبہ پیدا کیا، مجھے اپنی سانس گھٹتی محسوس ہوئی۔ مَیں نے غصے سے اپنے دانت بھینچے اور اضطراری کیفیت میں سراجے کے بالکل نزدیک ہو کر اُس پر فائر کھول دیا۔ اگرچہ وہ پل بھر میں ڈھیر ہو گیا لیکن مَیں نے بار بار اپنی میگزین گولیوں سے بھر کر اُس پر خالی کی، گویا فطری بزدلی کا حساب چکا رہا تھا۔ اس عمل کے کچھ ہی دیر بعد، جس میں مجھے لڑکے کی کراہیں سنی بند ہو گئیں تھیں، حمید سندھو باہر آیا تو مَیں بھاگ کر کوٹھڑی میں داخل ہو گیا۔ لڑکے کا جسم برہنہ اور قریباً زرد ہو چکا تھا۔ ننگے جسم پر بے شمار نیل پڑ گئے تھے۔ نبض کی رفتار تیزی سے سست ہو رہی تھی۔ مَیں نے اُس کا پاجامہ اُوپر کر کے اُسے کاندھوں پر اُٹھا لیا لیکن اب سب کچھ فضول تھا۔ جسم سے خون اتنا بہہ چکا تھا کہ اُس کے بچنے کی امید صفر تھی۔ شاید اس بات کو حمید سندھو نے بھی محسوس کر لیا تھا اس لیے اب اُس نے مجھ سے مزاحمت کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پولیس کو ایک واضح رعونت کے ساتھ اطلاع دینے میں محو ہو گیا، کیونکہ ایک اور کامیابی کا نوٹ اُس کی فائل میں درج ہو چکا تھا۔ پولیس آئی تو ہر طرف سکون تھا۔ گھنٹہ بھر کی واقعاتی رپورٹ کے بعد تینوں لاشیں وین میں رکھیں گئیں اور سہ پہر کے قریب ہم تھانے پہنچ گئے۔

میرے کانوں میں پولیس کے ترانے بے ہنگم اور مہمل آواز کے ساتھ سے گونجتے رہے۔ مَیں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا اسٹیج کی طرف بڑھتا گیا۔ دو تین قدم چلنے کے بعد میری حالت میں اعتدال آگیا۔ بالآخر مَیں نے بھی اپنا تمغہ ترانوں اور نعروں کے شور میں وصول کر لیا۔

سویٹر

چھوٹی نہر سے مغرب کی طرف شہر کی توسیع کی گئی تو پہلے ضلعی انتظامیہ کے دفاتر منتقل کیے۔ اُس کے بعد سرکاری ملازمین کی رہائشی کالونیوں کو جگہ دی گئی۔ اسی جگہ ایک بہاری کالونی بنا کر مہاجروں کو الاٹ کر دی گئی۔ کالونی کا اصل شہر سے فاصلہ تین کلومیٹر تھا۔ نئی آبادی شام ہی سے سنسان ہو جاتی اور عشا کے وقت اُلو بولنے لگتے۔ اُونچے درختوں کے جھنڈ اور پرندوں کی چہکار کے علاوہ پورے علاقے میں مکمل خموشی ہو جاتی۔ تمام علاقہ اصل شہر سے کٹا ہوا تھا لیکن سب سے زیادہ جس کالونی کا معاشرتی اور سماجی رشتہ منقطع تھا، وہ بہاری کالونی ہی تھی۔ زبان اور شکل میں بالکل الگ تھے۔ حکومت نے ان میں سے کچھ افراد کو چھوٹی موٹی نوکریاں بھی دیں مگر زیادہ آبادی بے روزگار تھی۔ خاندان بھی تقسیم تھے۔ بیٹا یہاں ہے تو باپ کراچی یا کسی دوسرے شہر میں۔ ایک سہولت جو ان کو حاصل تھی، وہ یہاں کی وافر اور خالی زمین کے قطعے تھے، جہاں یا تو درختوں کی بہتات تھی یا لمبی جڑوں والی ہری گھاس تھی۔ کچھ زمینوں پر ان کی عورتوں نے تھوڑی بہت سبزیاں کاشت کر لی تھیں، جنھیں سبزی منڈی بیچ آتیں۔ کالونی کے لڑکے سارا دن بلیرڈ کھیلتے، پان کی پیکیں پھینکتے یا ہندوستانی فلمیں دیکھتے۔ پڑھنے لکھنے میں اُن کو بالکل لگاؤ نہ تھا۔ ان لڑکوں میں سے کچھ کی سرگرمیاں کچھ اور ہی رخ اختیار کر گئی تھیں اور یہ پُر اسرار سرگرمیاں خموشی سے چل رہی تھیں، جو شہرام پر ابھی واضح نہیں تھیں۔ اُسے یہ تو علم تھا، اُس کے دوست لمبا ہاتھ مار رہے ہیں۔ خوشبودار پان، جینز کی نئی پینٹیں شرٹیں اور نئے جوتے خرید لینا آسان بات نہ تھی۔ اُن کی جیب میں ہر وقت پیسے بھی رہتے، حالانکہ ان سب کے گھروں میں جوئیں تک نہ تھیں۔ منّو کا باپ تو فالج سے لیٹا تھا، یہی حالت اُس کے دوسرے دوستوں کی تھی۔ بالآخر ایک دن اُس پر یہ راز کھل ہی گیا۔

کڑاکے کی سردی تھی اور رات کے دس بجے تھے۔ شہرام کی ماں کو سر درد نے چکرا دیا۔ پہلے تو وہ صبر کیے پڑی رہی لیکن درد برداشت سے بڑھ گیا تو چیخ اٹھی! اے چھوکرے، طبیعت کھراب ہووے گئی، سر پھٹا جاوے۔ شہر سے سر درد کی گولی لے آ۔ شہر کا نام سنا تو شہرام کے طوطے اُڑ گئے۔ رات ہُو کا عالم، دو میل پیدل کا سفر اور اُس پر سردی کا بلوہ۔ تھوڑی دیر کسمسا کر پڑا رہا، جب ماں نے گالیاں دینی شروع کیں تو بے چارہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ارادہ کیا، منّو کو ساتھ لیتا جاؤں۔ ٹراؤزر پہنا اور باہر نکل آیا۔ منّو کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر وہ گھر میں نہیں تھا۔ حیران کہ رات کے اس سمے کیا ہوا۔ سوچا رامی کو لیے جاتا ہوں۔ پتا کیا، تو وہ بھی غائب۔ ایک اور دوست کا دروازہ پیٹا مگر وہ بھی ندارد۔ بات معما ہو گئی۔ شہرام کو یقین ہو گیا کہ سب کسی مار پر جاتے ہیں اور ہم کو خبر نہیں کرتے۔ کانپتے ہوئے اکیلا نکل لیا مگر گھر سے ڈبل گراری کا چاقو اُٹھا لیا کہ ہر بہاری گھر میں اس کا ہونا ضروری تھا۔ اس کا پھل چھ انچ تیز لوہے کا تھا۔ کالونی کے پھاٹک سے باہر نکلا تو شدید سردی اور کُہر کا عالم تھا۔ شہرام نے سڑک کے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ اِدھر اُدھر سے گیدڑوں کے چیخنے اور اُلوؤں کی آوازوں سے دل میں ہول پیدا ہو رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف جامنوں کے پیڑ تھے، جنھیں دن کے وقت وہ ہزار بار دیکھ چکا تھا مگر اس وقت اُن کا گھنا پن اندھیرے میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس کی وجہ سے ہر طرف ہولناک فضا تھی۔ وہ چلتا گیا اور ڈر ڈر کے پیچھے دیکھتا گیا کہ اچانک اُس پر کوئی شے حملہ نہ کر دے۔ چاقو اُس نے کھول کر دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دو سو میٹر ہی چلا تھا کہ اُسے ایک سوزوکی کار آتی دکھائی دی۔ کوئی شخص کینٹ کی طرف سے آ رہا تھا اور کمپلیکس سے شارٹ کٹ مار کر شہر جا رہا تھا۔ یہ کالونی کا آدمی نہیں تھا کہ یہاں تو کار ایک طرف، کسی کے پاس سائیکل تک نہ تھی۔ شہرام کو خوشی ہوئی کہ اگر اُس نے لفٹ دے دی تو شہر جانے میں آسانی ہو جائے گی۔ چاقو اُس نے ٹراؤزر کی جیب میں رکھ لیا اور ہاتھ کے اشارے سے رُکنے کا اشارہ کیا۔ کار نزدیک آ کر رُک گئی۔ کار میں چالیس کی عمر کا خوش پوش آدمی تھا۔ چند مکالموں کے بعد شہرام اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں اُس نے شہرام کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ تو چودہ پندرہ سال کا نمکین اور کرارا لڑکا تھا۔ رات کی تنہائی اور سردی میں یوں سڑک کنارے مل جائے، واہ ری قسمت۔ اُس نے کئی پنجابی لڑکے دیکھے تھے مگر یہ اُن سے دو ہاتھ آگے تھا۔ اِدھر شہرام کے دل میں اچانک ایک نئے خیال نے جنم لیا۔ اُس نے سوچا، اس کے پاس

دو ہزار تو ضرور ہوں گے اور یہ بابو ممّی سا، شکل سے بزدل بھی لگتا ہے، اِسے ابھی چاقو دکھا کر لوٹ لینا چاہیے، رات کے اس وقت کسے خبر ہوگی۔ اُس کی آنکھوں میں ہیا فلموں کے کئی سین ایک کے بعد ایک آنے لگے اور دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے سوچا، ابھی ایکشن کروں تو دو منٹ کا کام ہے۔ پیسوں میں کھیل جاؤں گا مگر جیسے ہی ٹراؤزر کی جیب میں پڑے چاقو پر ہاتھ رکھا، دل سینے سے باہر نکلتا محسوس ہوا اور ماتھے پر پسینہ آ گیا، سوچا، پکڑا گیا تو بُرا پھنسوں گا۔ اِدھر یہی کیفیت اُس اجنبی کی تھی مگر عمر کی پختگی کے سبب اُس میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ کچھ لمحوں بعد اُس نے شہرام کے زانو پر ہاتھ رکھ دیا۔ شہرام اجنبی کے اس اچانک عمل پر تذبذب میں پڑ گیا اور اپنے چاقو اور رہزنی کو بھول گیا۔ اُس کا دماغ اُسی لمحے اپنے دوستوں، منجو، شبو، رامی اور کاجو کی طرف لوٹ گیا۔ بات اُس کی سمجھ میں آنے لگی کہ وہ سب رات کے اس وقت کس بلاوے کی اوٹ جاتے ہیں اور اُن کی جیبوں میں کھرے پیسوں کا کیا راز ہے۔ یہ سب اُسی لمحے اُس کی سمجھ میں آنے لگا تھا، وہ پیسے کسی کو لوٹنے سے حاصل نہیں ہوتے تھے۔ وہ سوچتا چلا گیا، مَیں بھی کہوں، منجو یوں رات سے بن سنور کے روز کہاں نکل جاتا ہے اور وہ سالا شبو...... ہوں۔ بڑا بدمعاش بنا پھرتا ہے۔

اِن سوچوں کے دوران چند لمحوں کے لیے اُس کا دماغ اجنبی سے ہٹ گیا مگر جلد ہی اُس نے محسوس کیا کہ اجنبی کا ہاتھ اُس کے زانو پر دوڑ رہا ہے اور کار کی رفتار نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ پھر وہ ہاتھ زانو سے آگے بڑھ گیا۔ اُس نے سوچا، اور اگر مَیں بھی...... کسی کو کیا پتا چلے گا، مفت میں پیسے آ جائیں گے...... نہیں ہرگز نہیں۔ اُس نے اجنبی کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے پرے کر دیا۔ کار آہستہ رفتار سے چلتی رہی۔ شہرام کا رُخ پھر اپنے چاقو اور ڈکیتی کی طرف ہو گیا۔ پھر اُسے اپنی ماں کا سر درد یاد آ گیا، پھر منجو، شبو اور کاجو سامنے آ گئے۔ دماغ پھرکی کی طرح گھومنے لگا۔ اجنبی کا ہاتھ پھر زانو پر ٹک گیا، مگر اِس بار اُس نے مزاحمت نہیں کی اور دوستوں کے نشن مشن کو تصور میں لے کر خود کو حالات کے بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ اُسے تب پتا چلا جب گاڑی ایک گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

وہ گیٹ سے نکلا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اجنبی نے اُسے ایک گرم سویٹر بھی دی اور روپے اس کے علاوہ تھے، جو چندرہ دن تک کافی تھے۔ وہ میڈیکل اسٹور پر پہنچا، میڈیسن لی اور کالونی کی طرف چل پڑا۔ اب اُسے فاصلے کی کوئی پرواہ نہیں تھی، آسانی سے رکشا لے سکتا تھا۔

بستر پر لیٹتے ہی اُسے پھر خیالوں نے گھیر لیا، اجنبی نے اُس کے ساتھ کتنا گھٹیا کام کیا

ہے۔ لمحہ بہ لمحہ یہ خیال اُسے کچوکے لگانے لگا۔ جیسے جیسے اُسے بیڈ پر اپنے ننگے پن اور شرمناک فعل کا نقشہ یاد آیا، احتجاج کی لہر شدید ہونے لگی اور اجنبی پر بہت غصہ آیا۔ اس نے سوچا، کاش ڈکیتی ہی کر لیتا۔ اِس سے مردانگی پر تو حرف نہ آتا۔ پھر کچھ سوچ کر ٹھٹک گیا، اگر ڈکیتی سے پکڑا جاتا تو زندگی تباہ ہو جاتی۔ تھانے والوں کے جوتے الگ پڑتے۔ وہ سوچ کر کپکپا گیا۔ غرض انہی خیالات میں اُسے نیند نے آلیا۔ صبح جاگا تو طبیعت میں عجیب سی بیزاری تھی۔ رات کی داستان آنکھوں میں گھومنے لگی۔ اُسے لگا، اُس نے خواب دیکھا ہے لیکن اضطراری طور پر ہاتھ ٹراؤزر کی جیب میں چلا گیا، جس میں رقم موجود تھی۔ اُس نے پیسے باہر نکالے، یہ وہی نوٹ تھے۔ وہ واپس کمرے میں آ کر لیٹ گیا اور ذہن کو اِدھر اُدھر مصروف کرنے لگا لیکن خیالات تھے کہ پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ کافی دیر پڑا رہا حالانکہ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ وہ نہ تو سنوکر کھیلنے کے لیے رامو کے کھوکھے پر گیا اور نہ ہی شاکا کے ہاں بچی تاکی پر فلم دیکھی۔ اُسے واہموں نے گھیرے رکھا، جیسے سب لڑکوں کو اُس کی حرکت کا پتا چل گیا ہو مگر کب تک یوں پڑا رہتا، شام چار بجے باہر نکلا اور دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رات والے واقعے کا کسی کو شک بھی نہ ہوا تھا۔ سب اُسے ویسے ہی مل رہے تھے، جیسے پہلے ملتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ہنسا کہ خوامخواہ پریشان ہو رہا تھا۔

....

یہ دوسرے ہفتے رات نو بجے کی بات ہے، وہ باہر نکلا تو اُسے منجو، کاجو اور مانی پُل پر کھڑے مل گئے۔ اب نہ تو اُسے اندھیرے سے ڈر لگا اور نہ ہی اُن کی پُل پر ملنے کی حیرانی ہوئی۔ وہ سب ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ مانی نے قہقہہ لگا کر کہا، سالا تُو بھی آ گیا، مَیں تو کئی دن سے تیری حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ ہمارے ساتھ کھڑا ہونے میں تجھے شرم آتی تھی۔ اُسے مانی کا یہ جملہ بہت بُرا لگا لیکن اب وہ ایک ہی حمام میں تھے، اِس لیے بڑی بات نہ تھی۔ تھوڑی دیر میں سب اپنے رستوں پر اُٹھ گئے۔

کام سے تو وہ رات گیارہ بجے ہی فارغ ہو چکا تھا لیکن فی الحال گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اُس نے شہر میں گھومنے کا ارادہ کیا، ایک کھوکھے سے دو بہترین کتھے کے پان بنوائے، پھر ٹھنڈی سڑک پر پیکیں پھینکتے ہوئے چلنے لگا۔ اس چھوٹے شہر میں ایک سرد رات میں، یہ وہ وقت تھا، جب شہر کا خال خال آدمی نظر آتا ہے۔ اِس عالم میں وہ چاہتا تھا، کوئی اور بھی آدمی مل جائے مگر اِس

خواہش میں شدت نہیں تھی۔ اُسے اس میں بھی بہت مزا آ رہا تھا کہ آوارگی، سرد رات، خوبصورت شہر اور سنسان سڑکیں اُس کی بے فکری کے لطف کو دوبالا کریں۔ ایسے میں کئی چکر اُس نے گول مسجد کے لگائے۔ فوارہ چوک اور لکڑی منڈی سے واپس کچہری بازار تک آیا، وہاں سے اسلامیہ ہائی سکول کی پچھلی گلی میں داخل ہو کر ایک سنوکر ہاؤس میں رُک گیا۔ اُس کا مالک سنوکر میز کو بند کر کے اُس پر کپڑا اچڑھا رہا تھا۔ وہ ایک دو منٹ رُک کر دیکھتا رہا، پھر آگے چل دیا اور صنم سینما کے پاس آ کر ٹکٹ خریدا اور رات کے پچھلے شو میں داخل ہو گیا۔ باہر نکلا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ اُس نے رکشہ پکڑا اور سیدھا کالونی کی راہ لی۔ اگلے دن آنکھ کھلی تو ایک بج رہا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر منہ دھویا، ناشتہ کیا اور باہر نکل گیا۔ رات والا ایک پان ابھی اُس کے پاس تھا، اُسے منہ میں رکھا اور مدو سنوکر پر پہنچ گیا۔ رات والے سب دوست موجود تھے مگر خموش معاہدے کے تحت ایک دوسرے کی پردہ داری کے ذمہ دار تھے۔ سنوکر پر ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد وہ شاد بھیا کی پکی تا کی پر فلم دیکھنے بیٹھ گیا۔ چار بجے گھر آیا، ٹین کا ڈبا پانی سے بھر کر چولہے پر رکھا اور شرٹ استری کرنے لگا۔ نہا دھو کر کھانا کھایا مگر آج ماش کی دال اچھی نہ لگی۔ اُس نے تھوڑا بہت زہر مار کیا، آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا پھر باہر نکل آیا اور سات بجے ہی روانہ ہو گیا۔ پُل پر آیا تو سردی اچھی خاصی تھی مگر دھند کا نام تک نہیں تھا۔ پہلے دن ملنے والی سویٹر نے سردی کو بہت حد تک روک رکھا تھا۔ ایک اُونی مفلر بھی کانوں پر لپیٹ لیا تھا، البتہ جوتوں کی حالت اُس کی پتلون سے پتلی تھی۔ آج کی کمائی سے اُس کا ارادہ جوتے لینے کا تھا۔ پُل پر کھڑے دس منٹ گزرے تھے کہ ایک موٹر سائیکل آتی دکھائی دی۔ اُس نے اشارہ کیا، موٹر سائیکل رُک گئی۔ ہلکی ڈاڑھی والا ادھیڑ عمر شخص تھا۔ شہرام نے کہا، مجھے گول چوک تک لیتے جائیں۔ موٹر سائیکل والے نے سر کے اشارے سے بیٹھنے کا عندیہ دیا۔ یہاں سے شہر کا فاصلہ موٹر سائیکل کے لیے زیادہ نہیں تھا۔ محض تین چار منٹ کی بات تھی اور اسی وقفے میں وہ اپنا شکار پھانس لیتا تھا، جس میں ابھی تک ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ اکثر ایسا ہوا کہ شہرام کو کم ہی کوشش کرنا پڑی تھی۔ جس سے لفٹ لیتا وہی پہل کرتا تھا، مگر یہ شخص بغیر کسی توجہ کے موٹر سائیکل سرپٹ دوڑائے جا رہا تھا، نہ کوئی بات نہ اشارہ۔ شہرام پر یہ وقت بہت گراں گزرنے لگا۔ صنم سینما سے گزر کر فوارہ چوک آ گیا اور کچھ ہی دیر میں گول چوک پہنچنے والے تھے، مگر خموشی جاری تھی حتیٰ کہ گول چوک آ گیا۔

کہاں اُترنا ہے؟

شہرام نے اضطراب کی وجہ سے یہ آواز سُنی ہی نہ تھی۔ اُس نے دوبارہ پوچھا تو جواباً شہرام نے ایک دم نہایت بے باکی سے اُس کے زانو پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ انتہائی غیر متوقع عمل تھا۔ اُس نے فوراً موٹر سائیکل روک دی اور نیچے اُتر کر شہرام کی گردن پکڑلی اور دو تین تھپڑ زور کے منہ پر رسید کیے۔ یہ نہایت نازک اور پتلا سا چھوکرا تھا، حواس مختل ہو گئے اور چکرا کر نیچے گر گیا۔ رات کے آٹھ کا وقت اور شہر کا مرکز تھا۔ پلک جھپکنے میں بھیڑ لگ گئی۔ موٹر سائیکل والا پٹائی کے ساتھ ساتھ گالیاں بھی دے رہا تھا، حرامزادہ، کشتی کا بچہ، (گرے پڑے کو پاؤں سے ایک اور ٹھوکر ماری) اوسور کے بچے! کیا تُو نے مجھے لواطی سمجھ رکھا ہے؟ تیری مَیں ایسی کی تیسی کر دوں گا اور ایک لات مزید رسید کر دی۔ اِسی اثنا میں ایک بڑے میاں بھیڑ میں سے آگے بڑھے اور بولے، بھائی کیا بات ہوئی؟ کیوں لڑکے کو مار رہے ہو؟

بابا جی، یہ رنڈی کا بیٹا مجھے لواطت کی دعوت دے رہا تھا۔ اُس نے چیختے ہوئے ایک اور تھپڑ دے مارا۔

اتنے میں مجمع بڑھ کر دگنا ہو گیا۔ ایک اور بولا، اوہو، دیکھو کتنا معصوم لگ رہا ہے اور اندر سے کتنا غلیظ ہے۔ مجھے یہ لگتا بھی بہاری ہے۔ انہوں نے سارے شہر میں گند پھیلا رکھا ہے۔ پیدا ہوتے ہی یہ کام شروع کر دیتے ہیں۔ اِس جملے سے بہت سے لوگ ہنسنے لگے۔ قہقہوں کے درمیان، زمین پر اُوندھا لیٹے شہرام نے اپنا چہرہ زمین میں چھپانے کی کوشش کی۔ اُسے محسوس ہوا، وہ بالکل ننگا ہے اور لوگ تیز ناخنوں اور سخت جبڑوں والے جانوروں میں بدل گئے ہیں اور اُس کے جسم کو نوچ رہے ہیں، دانت نکال کر ہنس رہے ہیں۔ وہ پوری طرح اپنے جسم کو سمیٹ کر زمین سے چپک گیا، جس کی طرف سے ابھی تک اُس پر کوئی وار نہیں ہوا تھا۔ اُسے پہلی رات والا شخص یاد آیا، جس نے گرم سویٹر دیا تھا۔ اُس نے سوچا، یہ سویٹر نہ ہوتا تو وہ بالکل ہی ننگا ہو جاتا اور سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتا۔

حاجی ابراہیم

یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ مجھے یہاں ایک کمپنی کی طرف سے ملک کولیکشن سپروائزر کی ملازمت مل گئی۔ میرا کام یہ تھا کہ دریائے ستلج اور بارڈر کے علاقوں کا سروے کر کے بتاؤں کہ یہاں دودھ کی مقدار کتنی ہے اور کم اخراجات پر زیادہ اور بہتر کوالٹی کا دودھ کیسے مل سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب بارڈر کے دونوں طرف کے لوگ رینجر کے ساتھ مل کر بارٹر سسٹم چلاتے تھے۔ یہ شہر بارڈر کے قریب ترین تھا اس لیے اس عمل میں سب سے آگے تھا۔ مال مویشی، شراب، پان اور اسلحے کی سمگلنگ یہاں کی ثقافت میں شامل ہوگئی۔ پان کی پیکوں سے گلی کوچے رنگین اور شراب پی کر بہکنے والوں کے جھگڑے عام تھے۔ سرحد پار سے شراب کی درآمد نے یہاں کی منڈی کو ایسے بڑھاوا دیا کہ یہ دوسرے شہروں کو بھی سپلائی ہونے لگی۔ ڈیمانڈ بڑھی تو اُسے پورا کرنے کے لیے لوگوں نے گھروں میں بھٹیاں لگالیں۔

میرے ساتھ تین کولیگ اور ایک ہمارا انچارج افسر بھی تھا۔ یہ انچارج افسر شادی شدہ، نیک اور متقی قسم کا آدمی تھا۔ کمپنی نے اُسے ایک جیپ دے رکھی تھی۔ اس نے اپنا مکان یہاں سے تیس کلومیٹر دور ایک دوسرے شہر میں لے لیا، جہاں وہ بیوی بچوں کے ساتھ منتقل ہوگیا۔ ہمیں موٹر بائنک ملے تھے اس لیے یہیں رہتا تھا۔

کمپنی نے یہاں ایک برف خانے میں دودھ ٹھنڈا کرنے کا چلنگ پلانٹ لگادیا کہ مضافات سے آنے والے دودھ کو دو ڈگری سینٹی گریڈ تک لایا جائے تاکہ مرکزی پلانٹ تک پہنچنے سے پہلے خراب نہ ہو۔ یہ کارخانہ حاجی ابراہیم کا تھا۔ شہر میں اس کے علاوہ اُس کے دو پٹرول پمپ اور ایک یوریا کھاد کی ایجنسی بھی تھی، یعنی خوشحال آدمی تھا۔ پانچ دفعہ حج پر جاچکا تھا۔ لوگ اُسے

الحاج ابراہیم کے نام سے بلاتے اور عزت کرتے۔ حاجی صاحب اخلاق کے نہایت اچھے اور بامروت آدمی تھے۔ مَیں جب بھی اُسے دیکھتا، متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا لیکن آئے دن کرائے کے معاملے میں اُس کی کمپنی کے ساتھ کافی چخ چخ ہوتی۔

یہ شہر رنگا رنگی اور دلآویزی میں اپنی مثال آپ تھا۔ یہاں دس بارہ مدرسے تھے، جہاں پانچ ہزار کے قریب لڑکے پڑھتے اور کم و بیش سارا شہر نمازی تھا۔ آئے دن شیعہ، سُنی مناظرے ہوتے، ایک طرف مجلس جاری ہے تو دوسرے طرف شانِ صحابہ کانفرنس کا اہتمام ہے اور دونوں طرف عوام کا جمِ غفیر نعرے مارتا ہوا جوشِ ایمان کو تقویت دیتا ہے۔ دوسری طرف عالم یہ کہ شہر زندگی سے بھرپور تھا۔ مجرے، ڈھول، تماشے، تھیٹر، قوال رات گئے محفلیں جمائے رکھتے۔ کہیں قصہ گوئی، کہیں مجرا۔ ایک کونے میں تھیٹر ہے تو دوسرے میں رقص۔ کوئی گھر طبلے اور باجے سے خالی نہیں تھا، خدا جانتا ہے اِن میں طبلے کی تھاپ کا ہنر وہبی تھا۔ ہم نے بیسیوں دفعہ شرط لگا کر آزمایا، اس شہر کا چھوٹے سے لے کر بڑے تک، ہر پیشے اور ذات کا شخص طبلہ بجانے کا ہنر جانتا تھا، یہی حالت اِن کے باجا بجانے کی تھی۔ ہر روز کسی بزرگ کا عرس ہوتا۔ یہ عرس مرغ، بٹیر، بیل اور کتے لڑانے والوں کی گویا عید تھے۔ گلی گلی رنڈیاں معاملے کرتیں اور نوعمر لڑکے شراب کی دعوت کی پیشکش کرتے، انھی میں ہیروئن اور چرس بیچنے والے مل جاتے۔ شراب پانی کی طرح اور افیون نمک مرچ کی طرح بکتی۔ نہ کسی تھانے والے کو اعتراض اور نہ مولوی کو شکوہ۔ اس عالم میں ہم چار کنوارے کہاں تک پیغمبری کرتے، آخر رنگ پکڑنے لگے۔ مَیں اور ڈاکٹر وارث رات آٹھ بجے نکلتے اور ایک بجے گھر پلٹتے۔ روز مجرا اور تھیٹر دیکھتے۔ جس محلے میں ہماری رہائش تھی، وہ پرانے قلعے کے ساتھ جڑا تھا اور پرانے قلعے کو ہیرامنڈی سمجھا جاتا۔ قلعہ اور اس کی آبادی ایک اُونچے ٹیلے پر تھے اور یہی حقیقی شہر تھا۔ تقسیم کے بعد اس کے اردگرد نئی آبادیاں بنیں، پھر اِس علاقے کو پرانا قلعہ کہا جانے لگا اور نئی آبادیوں کو شہر کا نام دے دیا گیا۔ کچھ ہی دنوں میں ہماری یہاں جان پہچان ہوگئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جس آدمی سے مکان کرائے پر لیا تھا، وہی ہمارے لیے دلالی کرتا۔ مجھے آج بھی اعتراف ہے، اپنے کام میں انتہائی ماہر اور دیانت دار شخص تھا۔ شراب کو نجس اور اسلام میں حرام سمجھ کر بالکل نہ پیتا اور نماز کے بارے میں کہتا کہ جب دلالی چھوڑوں گا تو پہلے حج کروں گا، اُس کے بعد نماز شروع کروں گا۔ وہ دلالی کے ساتھ حکمت بھی کرتا تھا، اِن دو کاروبار کی

مناسبت اُسے ایسی راس آئی کہ دنوں میں اُس کا ڈنکا پورے شہر میں بجنے لگا۔ پرانے شہر کی تنگ گلیاں، چھوٹے مکان اور مکانوں کے اندر ہی چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں، جن میں چائے اور مٹھائی کی ہوٹلیں زیادہ تھیں، یہاں سارا دن تاش پھینٹی جاتی اور معاملے طے پاتے۔

ہم بہت خوش تھے لیکن جلد اِن معاملات کی خبر انچارج افسر ارشد شاہ کو ہو گئی۔ اُس کی پارسائی کے بارے میں بتا چکا ہوں، دوسرا خطرہ اُسے یہ تھا کہ ہم کہیں کمپنی کے دودھ کا ایک حصہ یہیں پر تقسیم نہ کرنے لگ جائیں، اُس کی یہ بات ٹھیک بھی تھی، پچھلے چار مہینے سے ہماری سخاوت کے سبب پانچ سات گھروں میں دودھ کی مفت سپلائی ہو چکی تھی۔ شاہ صاحب نے مالک مکان سے کہا، آپ ہمارے لڑکوں کو خراب کر رہے ہیں اس لیے اگلے مہینے ہم مکان خالی کرنے والے ہیں اور اگلے مہینے مکان خالی کر دیا گیا۔ نئی رہائش سوچ سمجھ کر پرانے قلعے سے دُور ایک بوڑھی خاتون سے لی گئی، جو اکثر اپنے بیٹے کے پاس لاہور رہتی۔ اُس نے مکان میں سے ایک کمرہ اپنے لیے رکھ لیا تھا کہ جب لاہور سے آیا کرے گی تو یہیں رہا کرے گی۔ کمرے کی چابی ایک خاتون کو دے گئی کہ روزانہ جھاڑ پونچھ کر کے رکھے۔ وہ خاتون یہ سب کام تو کرتی مگر اِس کے ساتھ ایک اور کام بھی کرتی کہ آئے روز کسی مرد کو لے آتی۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ باہر سے اجنبی کو لانے کی بجائے مکان کے موجودہ رہائشیوں کو ہی استعمال کر لیا کرے مگر وہ اِس معاملے میں کافی بے پروا ثابت ہوئی۔ اس بات پر ارشد شاہ تو ایک طرف، ہمیں بھی اعتراض تھا۔ ہم نے تہیہ کیا، بڑھیا کے واپس آنے پر اِس فاحشہ عورت کا پردہ چاک کریں گے۔ کچھ دنوں بعد بڑھیا واپس آئی تو ہم نے خاتون کے تمام کرتوت بیان کر دیے۔ بڑھیا نے بات سُنی اور کھڑے کھڑے حکم جاری کیا کہ اسی وقت اپنا سامان اُٹھاؤ اور میرے گھر سے نکل جاؤ، جس پر تم نے الزام لگایا ہے، وہ عرصے سے بیٹی کی طرح میری خدمت کر رہی ہے۔ مَیں نے کبھی اُس میں ایسی بات نہیں دیکھی بلکہ تم نے اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہو گی۔ تمھارے قابو میں نہ آئی تو بدنام کرنے لگے مَیں ابھی جھوٹ سچ بتا کرتی ہوں۔ بڑھیا کی یہ کیفیت دیکھ کر ہمیں اُلٹا اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ ارشد شاہ کی حالت تو ایسی غیر ہوئی۔ اِس سے پہلے کہ بڑھیا خاتون کو بلاتی، پھر دونوں مل کر پولیس کو بلاتیں، ہم نے سامان اُٹھایا اور دفتر آ کر پناہ لی۔ جو ایڈوانس دیا تھا، اُس کی واپسی کا نام تک نہ لیا اور جان کی امان پائی۔ اب ہمارے لیے سب سے بڑی مصیبت کہ کہاں رہیں؟ بیسیوں رہائشیں

دیکھیں، کسی جگہ پانی کا مسئلہ، کہیں قریب میں ریلوے کا اسٹیشن، کہیں مسجد کا پچھواڑہ اور مولوی کا شور، کسی جگہ قریب میں چرس اور شراب کا دھندا اور کوئی ایسی غیر محفوظ کہ اپنا آپ کے بھی چوری ہونے کا خطرہ۔ ارشد شاہ کو ہماری نسبت سب سے بڑا خطرہ شراب کا تھا، یعنی ہمیں، اس کی لت نہ پڑ جائے۔ وہ ہر ایسے مکان سے دور رکھنا چاہتا تھا، جس کا مالک شراب پیتا ہو یا اُس کے آس پاس شراب پینے والے بستے ہوں۔ یہ ایسی بات تھی جو اُس شہر میں پہاڑ کھود کر دودھ نکالنے سے کم نہ تھی۔ مسئلہ لاینحل صورت اختیار کر گیا اور رہنے کے لیے مناسب جگہ نہ مل سکی۔ ایک دن ارشد شاہ نے یہ قضیہ حاجی ابراہیم کے سامنے رکھ دیا۔ حاجی ابراہیم نے تحمل سے بات سُن کر کہا، شاہ صاحب! میرا اپنا مکان موجود ہے۔ وہ اتنی بڑی کوٹھی ہے اور رہنے والے ہم صرف تین ہیں۔ ایک مَیں اور دو میری بیٹیاں۔ نیچے کا پورشن ہم رکھ لیتے ہیں، اُوپر آپ آ جائیں۔ ہم نے کہا حاجی صاحب! پہلے کیوں نہ بتایا کہ آپ کے پاس مکان کرائے کے لیے خالی ہے۔ کئی دن سے خراب ہو رہے ہیں۔

بولا! بھئی بات یہ ہے کہ مَیں مکان کرائے پر نہیں اُٹھاتا۔ اس شہر کا ماحول خراب ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں، شریف آدمی کے لیے کتنا خوفناک شہر ہے۔ جسے ٹٹولو، وہی لفنگا ثابت ہوتا ہے۔ رنڈی بازی، چوری، مجرے، غرض کون سی بُرائی ہے، جو اس شہر کے باسیوں میں نہیں۔ میری جوان بیٹیاں ہیں، مشکل سے عزت بچائے بیٹھا ہوں۔ آپ کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اس لیے کہہ دیا، کوئی اور ہوتا تو نہ دیتا۔

ہم نے اُسی دن مکان دیکھا، بہت خوش ہوئے۔ فوری معاملہ طے کیا اور بالائی حصے میں منتقل ہو گئے۔ کرایہ کمپنی نے ادا کرنا تھا، وہ سال بھر کا پہلے دن ہی دے دیا۔ ارشد شاہ کو یہاں ایک وہم ضرور تھا اور وہ ہم چار عدد کنواروں اور اُس کی دو معصوم بیٹیوں کی بابت۔ شاہ صاحب نے ہمیں پارسائی کے متعلق نہج البلاغہ سے کئی بلیغ خطبے پڑھ کر سنائے اور کہا، اللہ دو گناہوں کو نہیں بخشتا، ایک زنا اور دوسرا امانت میں خیانت اور ان دونوں گناہوں کی وافر سہولت حاجی صاحب کے مکان میں موجود ہے، اِن سے احتیاط بہت ضروری ہے۔ حاجی صاحب صبح آٹھ بجے گھر سے نکلتے، کچھ وقت پٹرول پمپوں پر، کچھ کھاد کی دوکانوں اور ایک گھنٹا برف کے کارخانے پر گزارتے۔ یہ تھوڑا تھوڑا وقت بھی مل کر حاجی صاحب کو رات کے آٹھ بجا دیتا۔ سارا دن وہ گھر سے باہر رہتے اور اُس کی دونوں بیٹیاں گھر کے اندر۔ پردہ بالکل نہیں کرتی تھیں لیکن صحن میں کم ہی نکلتیں۔ ہم چاروں

نے اُنھیں دیکھ لیا تھا۔ چالیس سال کی عمر کے لگ بھگ ضرور تھیں مگر خوبصورت تھیں۔ پتا نہیں حاجی صاحب نے ابھی تک کیوں کر بٹھا رکھی تھیں۔ دس پندرہ دن نکل گئے۔ ہمیں نہج البلاغہ کے خطبے بھولنے لگے تو ہم اُن کی تاک میں لگ گئے۔ باری باری جوانی اور کنوار پن کی جھلکیاں دکھاتے، بال سنوارتے، دن میں کئی بار اُوپر نیچے زینے چڑھتے، مگر اُدھر سے موقع ہی نہیں دیا جاتا تھا۔ کسی کام کے لیے صحن میں آتیں تو دھیان کام پر رکھتیں، اُس کے بعد اندر چلی جاتیں۔ ہماری تانک جھانک اور اُن کی پارسائی کا یہ سلسلہ آٹھ دس دن چلا۔ جب کچھ توجہ نہ ہوئی تو ہم نے بھی لعنت بھیجی اور اپنے کاموں میں لگ گئے، جن کے لیے کمپنی تنخواہ دیتی تھی۔

یہ محلّہ غلہ منڈی کے پہلو میں تھا اس لیے ہوٹلیں بہت تھیں، ان کے باہر بڑی چارپائیاں پڑی رہتیں۔ مضافات سے اجناس لے کر آنے والے یہاں بیٹھ کر شراب پیتے، کھانا کھاتے اور غل غپاڑا کرتے۔ اسی میں اکثر سر پھٹول ہو جاتی اور ہمارے دیکھنے کو شغل رہتا۔ دکانوں پر اجناس کے ساتھ ہر طرح کی شراب بھی رکھی جاتی، جن میں ووڈکا انڈین سے لے کر ولایتی اور دیسی بھی کھلے عام فروخت ہوتی۔ ہر دوکان پر ایک اشتہار بھی چسپاں تھا، جس میں ،حاجی کے شربت، کی تشہیر تھی۔ یہ اشتہار کم وبیش سارے شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ حاجی کون حکیم تھا اور اِس شربت کے کیا فوائد تھے؟ ہم نے کبھی توجہ نہیں دی البتہ شراب کی فروخت کے متعلق شروع میں ضرور تعجب تھا کہ کیا بصیر پور پاکستان کی اسلامی ریاست میں نہیں آتا؟ مگر کچھ ہی دنوں میں ہمارے لیے بھی یہ ایک معمول ہو گیا۔

اس محلے میں رہتے ہمیں قریب ایک ماہ ہو گیا، کوئی شکایت نہ ہوئی، بلکہ ایک طرح سے رونق افزا ماحول تھا۔ ایک دن مَیں رات اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا، اچانک میری ناک میں شراب جیسی بو کی ہلکی سی لہر پیدا ہوئی، اُس کے بعد وہ بُو مسلسل آنے لگی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ مَیں نے اس تاثر کو دماغ سے جھٹک دیا اور سو یا رہا مگر وقفے وقفے سے تمام رات یہ بو آتی رہی۔ مَیں نے وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور صبح کام پر چلا گیا۔ دوسری رات بُو مزید تیز ہو گئی۔ اب مجھے شبہ ہوا کہ دوستوں میں سے کوئی اس ڈگر پر چل نکلا ہے اور ارشد شاہ کی ساری احتیاطیں دھری رہ گئیں۔ اگلے دن ناشتے کے وقت ساتھیوں کے سامنے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم میں سے ایک آدمی نے بالآخر صراطِ مستقیم پکڑ لی ہے۔ رات بھر شراب کی بو آتی رہی ہے۔ سب نے اپنے آپ کو

اس فعل سے بری اور دوسرے پر شبہ کیا لیکن اس پر سب کا اتفاق تھا کہ بُو ضرور آتی رہی ہے، غور کیا جائے تو ابھی بھی آ رہی ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کے منہ سونگھے مگر کچھ پلے نہ پڑا۔ اپنے باورچی پر شک ہوا کہ اُس نے باورچی خانے میں اسٹاک جمع کر دیا ہے لیکن اُس نے کہا کہ وہ پیتا تو بے شک ہے مگر اتنی توفیق نہیں کہ جی بھر کر حسرت نکال سکے، اس لیے میری طرف سے خوش گمانی نہ رکھیں۔ اگلے دن رات کی بجائے دن کو بھی آنے لگی اور پہلے سے تیز ہو گئی۔ ہم نے ایک دوسرے کے سامان کی تلاشی لی مگر کوئی چیز ہاتھ نہ لگی، آخر ارشد شاہ کو آگاہ کیا، اول اُس نے ہمی پر شک کیا اور کہا، کہ یہ بُو حاجی ابراہیم یا اُس کی بیٹیوں تک پہنچی تو بے عزت ہوں گے۔ وہ سوچے گا، یہ بھی لفنگے نکلے۔ کسی بھی وقت بدمعاش کہہ کر گھر سے بے دخل کر سکتا ہے۔ تین جگہ کمپنی کا ایڈوانس پھنسا کر چوتھی جگہ منتقل ہونا بھی ناممکن ہو چکا ہے اس لیے اب شہر بدر ہی ہوں گے۔

اُنھی دنوں ایک روز حاجی ابراہیم بیٹیوں کے ساتھ تیسری بیٹی کو ملنے حجرہ شاہ مقیم چلا گیا اور مکان کی رکھوالی کے لیے ایک نوکر چھوڑ گیا۔ یہ نوکر برف خانے میں کام کرتا تھا اور ہم سے خوب واقف تھا۔ ہم رات کے کھانے پر بیٹھے تو وہ نوکر بھی پاس آ بیٹھا۔ مَیں نے اُسے کہا، احمد علی! یہ بتا، تمھیں کسی شے کی بُو آ رہی ہے؟ اُس نے تین چار سانس اُوپر نیچے کھینچے اور بولا، جی ہاں، وکی شراب کی بُو ہے۔

یہ کہاں سے آتی ہے ذرا پتا تو کر؟ ہم چاروں میں سے تو کوئی نہیں پیتا ہے، مَیں نے کہا۔

اُس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا، بھائی صاحب! آپ بھی بہت بھلے مانس ہیں۔ مَیں یہ مسئلہ حل کر سکتا ہوں اگر مجھے ہزار روپیہ دیں۔ مَیں نے کہا، ہم ہزار دینے کو تیار ہیں۔

لاؤ پیسے نکالو، اُس نے فوراً ہاتھ آگے کر کے کہا۔

ہم چاروں نے اپنی اپنی جیب سے دو دو سو روپیہ نکال کر اُسے دیا اور کہا، یہ آٹھ سو رکھو۔

احمد علی نے پیسے جیب میں رکھے اور کہا آؤ میرے ساتھ۔ وہ ہمیں لے کر نچلے پورشن میں آ گیا اور وسیع و عریض صحن کے شمالی حصے میں پہنچ کر برآمدے میں داخل ہوا، پھر کونے والا کمرا کھول دیا۔ کمرا کھلتے ہی تیز بُو کے بھبھوکے ہماری ناکوں کو چیرتے ہوئے روح تک اُتر گئے۔ اُس نے کمرے میں موجود ایک الماری کو ایک طرف کیا۔ دوسری طرف نیچے سیڑھیاں اُتر رہی تھیں، ہم اُس کے پیچھے سیڑھیوں میں اُتر گئے، یہ ایک بڑا تہہ خانہ تھا۔ احمد علی نے تہ خانے کی بتیاں روشن کر

دیں۔ دیکھا تو تین عدد شراب بنانے کی بھٹیاں اور پانچ چھ ڈرم تھے، جن کے اندر مختلف اشیا گل سڑ کر خمیر اور شراب کا خام مواد تیار ہو رہا تھا۔ اِن کے علاوہ گیس کے سلنڈر، کانچ کے بڑے مرتبان، قرع وانبیق، کانچ کی بہت سی خوبصورت خالی بوتلیں، ٹھکر، ڈھکن اور سیل کرنے کی مشین اور پتا نہیں کیا کچھ شراب بنانے اور اُسے صاف کرنے کے آلات پڑے تھے۔ ہماری حیرت اور کھلی آنکھوں کو دیکھ کر احمد علی ہنسنے لگا، اور بولا، یہ جو آپ کو تیز بُو آ رہی تھی، وہ یہی ڈرموں میں پڑی چیزوں کی تھی، جو گل سڑ کر شراب بننے کے مرحلے میں ہیں۔ پندرہ دن بعد یہ بالکل تیار ہو جائے گی۔ اُس کے بعد انہیں چولہوں پر چڑھا دیا جائے گا اور ایک مہینے کے اندر شراب تیار ہو جائے گی۔

انہیں تیار کون کرے گا؟ ڈاکٹر وارث نے حیرانی کے غوطے سے سر اُٹھا کر پوچھا

حاجی صاحب کی دونوں بیٹیاں، احمد علی نے جواب دیا، اس کام میں اُن کی مدد کے لیے حاجی صاحب صرف میری ڈیوٹی لگاتے ہیں۔

کیا وہ شراب بنانا جانتی ہیں؟ مَیں نے پوچھا

سر جی ایسا ویسا جانتی ہیں؟ وہ بولا، بلکہ پورے شہر میں حاجی کے شربت کی جو ڈیمانڈ ہے، وہ انڈین شراب کی بھی نہیں۔ اس میں ایسے ایسے عرق ڈالتی ہیں کہ بندہ نشوں میں رہتا چلا جاتا ہے۔ اِسی لیے تو حاجی صاحب اُن کی شادی نہیں کر رہے۔

اوہو، تو یہ شربت ہے جس کے اشتہار پورے شہر میں چسپاں ہیں، میری حیرانی کی انتہا نہ رہی

جی ہاں، وہ بولا، یہ جو آپ سارے شہر میں شربت کے اشتہار دیکھتے ہیں، اسی شراب کے ہیں،

کیا حاجی ابراہیم خود بھی پیتا ہے، ڈاکٹر وارث نے پوچھا،

نہیں وہ بہت پرہیزگار آدمی ہیں، انھوں نے کبھی قطرہ بھی نہیں چکھا، کہتے ہیں، یہاں پی تو جنت میں نہیں ملے گی۔

اور حاجی صاحب کی بیٹیوں نے؟ مَیں نے احمد علی کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ تو پینے میں پوری کھلاڑی ہیں۔ احمد علی نے آنکھ دبا کر کہا، مگر اللہ قسم مَیں نے کبھی اُنہیں پورے نشے میں نہیں دیکھا۔ آرام سے پیتی ہیں اور پتا بھی نہیں چلنے دیتیں۔

حاجی صاحب کو پتا ہے کہ وہ پیتی ہیں؟ ڈاکٹر وارث نے سوال کیا

ڈاکٹر صاحب! کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ وہ بتانے لگا، جب تک پی کر ٹیسٹ نہ کر لیں تو کیسے پتا چلے کہ ذائقہ کیسا لگا، نشہ کیسا دے گی، ہے کچی ہے یا پک گئی ہے، کون کون سی چیزوں کا ست خوشبو دے رہا ہے اور کون سی چیزیں دب کر رہ گئیں۔ اب تو پی کر یہ بھی بتا دیتی ہیں کہ کس شے نے اس میں نشہ بڑھایا ہے اور کس کا خمیر پورا تیار نہیں ہوا۔ بھائی جان! حاجی صاحب کی بیٹیوں کو اس کام میں کوئی چیلنج نہیں دے سکتا۔ یہ بات میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔

دوسرے دن ہم نے ارشد شاہ کو اس معمے کے حل ہونے کی خبر دی تو اُس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اُس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہیڈ کوارٹر جا کر اپنی ٹرانسفر کی درخواست دے دی اور تین دن کے اندر شہر سے چلا گیا۔ ہمارا ٹرانسفر یا مکان بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، آخر کس لیے بدلتے؟
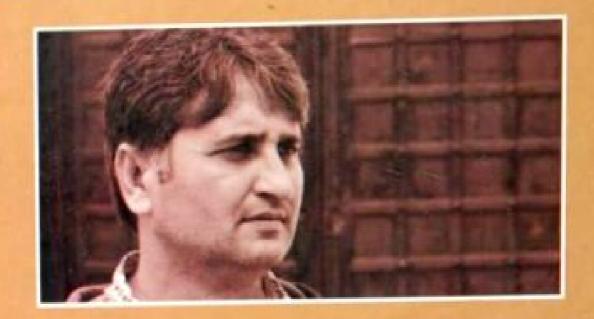
احباب اپنے افسانوں کے بارے میں کیا لکھوں! ہاں یہ ضرور ہے کہ کچھ عرصہ پہلے افتخار عارف
نے مجھے 'اکادمی ادبیات' میں اپنے زیرِ سایہ لیا تو میری خوش بختی کا آغاز ہو گیا۔ 2010ء میں
شاعری کی پہلی کتاب ''بے یقین بستیوں میں'' چھپی۔ 2012ء میں ''قائم دین'' (افسانے)،
2014ء میں ''نولکھی کوٹھی'' (ناول) اور اب ''شاہ محمد کا ٹانگہ'' (افسانے) آپ کے سامنے ہے۔
مجموعی طور پر میری ساتویں کتاب ہے۔ یہ کیسی ہے اور میں کہاں تک کامیابی کے سفر کو برقرار رکھ سکا
ہوں، یہ فیصلہ آپ کریں گے۔

Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com